ISSN 0970-180X

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

جو لوگ ہار مان لیں وہی جیتتے ہیں
جو لوگ پیچھے ہٹنے پر راضی ہو جائیں
وہی دوبارہ اگلی صف میں جگہ پاتے ہیں
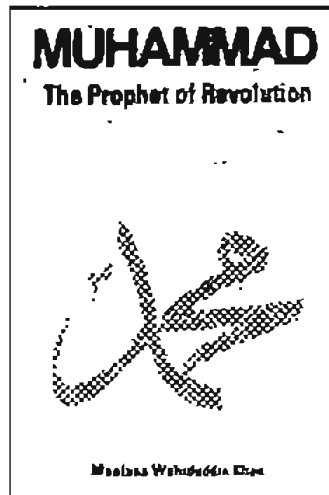
جون ۱۹۸۷ شمارہ ۱۲۷

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

جون ۱۹۸۷ شمارہ ۱۲۷

فہرست

ماہنامہ الرسالہ ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ ، فون : 611128 697333

تکبیرِ رب

قرآن میں مویشیوں کا اور قربانی کے اونٹوں کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوا ہے کہ ان جانوروں کو خدا نے تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے تاکہ اللہ کی ہدایت پر تم اس کی بڑائی کرو (کَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ، الحج ۳۷)

انسان بھیڑیئے اور ریچھ کو اپنا خدمت گار نہیں بنا سکتا۔ مگر بیل اور اونٹ سے وہ مختلف قسم کی خدمت لیتا ہے۔ یہ تسخیر کی بنا پر ممکن ہوا ہے۔ جن جانوروں کو مویشی کہا جاتا ہے، ان کے اندر جبلی طور پر یہ مزاج ہے کہ وہ انسان کے تابع بن جاتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مویشیوں سے کام لینا بھی اتنا ہی دشوار ہوتا جتنا وحشی جانوروں سے کام لینا دشوار ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک عظیم نعمت ہے۔ ایمان یہ ہے کہ آدمی اللہ کے اس تخلیقی کرشمہ کو جانے اور اس پر شکر گزاری سے اس کا دل لبریز ہو جائے۔ اللہ کا ایک بندہ جب اللہ کے نام پر جانور کی قربانی کرتا ہے تو یہ گویا اس کے دل کی کیفیت کا ایک خارجی اظہار ہوتا ہے۔ وہ گویا عمل کی زبان میں کہتا ہے کہ خدایا، تو نے اگر ان حیوانات کو ایسا نہ بنایا ہوتا تو میرے لیے ممکن نہ تھا کہ میں ان کو اپنے لیے مسخر کر سکوں۔

یہی معاملہ موجودہ دنیا کی تمام چیزوں کا ہے۔ ہر چیز انسان کے لیے خدا کی نعمت ہے۔ ہر چیز اسی وجہ سے انسان کے لیے قابلِ استعمال ہے کہ وہ انسان کے لیے مسخر کر دی گئی ہے۔ ہر چیز کا تقاضا ہے کہ اس کو دیکھ کر انسان کے اندر خدا کی عظمت کا احساس جاگ اٹھے۔ اس کا سینہ خدا کی بڑائی کے جذبے سے سرشار ہو جائے۔ یہی تکبیرِ رب ہے۔ تکبیرِ رب اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے ایک نفسیاتی فعل ہے۔ اسی معنی میں ارشاد ہوا ہے کہ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (المدثر ۳) اور وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا (الاسراء ۱۱۱)

تکبیرِ رب دراصل معرفت کا ایک بھونچال ہے جو مومن کے اندرونی وجود میں برپا ہوتا ہے۔ یہ ایک شخصیت کا عرفانِ خداوندی سے پھٹ پڑنا ہے، اور اللہ اکبر کا کلمہ اسی پھٹ پڑنے کا ایک لفظی اظہار۔

تخلیقیت

موجودہ دنیا مختلف قسم کے اسباب اور احوال سے بھری ہوئی ہے۔ یہ اسباب اور احوال ہم سے الگ اپنا وجود رکھتے ہیں اور آپ اپنے زور پر قائم ہیں۔ ہم ان سے ہم آہنگی کرکے اپنا مقصد حاصل کر سکتے ہیں، ان کو نظر انداز کرکے منزلِ مقصود تک پہونچنا ہمارے لیے ممکن نہیں۔

اس صورت حال کے تقاضوں میں سے ایک تقاضا یہ ہے کہ آدمی کے اندر یہ صلاحیت ہو کہ وہ پیش آمدہ حالات کے اعتبار سے پورے معاملہ پر از سر نو غور کر سکے۔ وہ مسئلہ کا نیا حل دریافت کرنے کی طاقت رکھتا ہو۔ اسی معنی میں ایک فرانسیسی مفکر (Emile Chartier) نے کہا ہے کہ کوئی چیز اس سے زیادہ خطرناک نہیں کہ آدمی اپنے پاس صرف ایک ہی تصور رکھتا ہو:

Nothing is more dangerous than an idea
when it is the only one we have.

اکثر حالات میں ایسا ہوتا ہے کہ کسی مسئلہ کے حل کے لیے ہماری ابتدائی تدبیر غیر موثر ہو جاتی ہے۔ ایسے موقع پر ضرورت ہوتی ہے کہ ہم اپنی سابقہ سوچ کے دائرہ سے نکل کر کوئی نئی تدبیر اختیار کر سکیں۔ اسی صلاحیت کا نام تخلیقیت (Creativity) ہے۔ اور اسی تخلیقی صلاحیت میں آدمی کی کامیابی کا راز چھپا ہوا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اس اصول کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ غزوۂ بدر کے موقع پر آپ دشمنوں سے لڑے۔ مگر غزوۂ احزاب کے موقع پر آپ نے اپنے اور دشمن کے درمیان خندق کی رکاوٹ قائم کر دی۔ غزوۂ احد میں آپ نے اپنے مخالفین سے باقاعدہ جنگ کی اور حدیبیہ کے موقع پر جنگ کیے بغیر واپس چلے آئے۔ غزوۂ حمراء الاسد میں آپ نے اعلان و اظہار کے ساتھ مارچ کیا اور فتح مکہ کے سفر میں مکمل خاموشی کا طریقہ اختیار فرمایا، وغیرہ۔

دوسرا موقع

ریڈرز ڈائجسٹ فروری ۱۹۸۷ میں ایک مضمون شائع ہوا ہے، اس کا عنوان ہے:

Dare to Change Your Life

(اپنی زندگی کو بدلنے کی جرأت کرو) اس مضمون میں کئی ایسے واقعات دیے گئے ہیں جن میں ایک شخص کو ابتداءً ناکامی پیش آئی۔ وہ نقصانات اور مشکلات سے دوچار ہوا۔ مگر اس نے حوصلہ نہیں کھویا۔ ایک موقع کو کھونے کے باوجود اس کی نظر دوسرے موقع پر لگی رہی۔ یہ تدبیر کارگر ہوئی۔ ایک بار ناکام ہوکر اس نے دوسری بار کامیابی حاصل کرلی۔

مضمون کے آخر میں مضمون نگار نے لکھا ہے کہ زندگی دوسرے مواقع سے بھری ہوئی ہے۔ دوسرے موقع کو استعمال کرنے کے لیے جو کچھ درکار ہے وہ صرف یہ صلاحیت ہے کہ آدمی اس کو پہچانے اور حوصلہ مندانہ طور پر اس پر عمل کرے:

Life is full of second chances. All we need for a second chance is the ability to recognize it and the courage to act.

زندگی سکنڈ چانس (دوسرے موقع) کو استعمال کرنے کا نام ہے —— یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو فرد کے لیے بھی اتنی ہی صحیح ہے جتنی قوم کے لیے۔ پوری تاریخ اس حقیقت کی تصدیق کرتی ہے۔ دور اول میں اسلام کو مکہ میں موقع نہ مل سکا۔ اس کے بعد اسلام نے مدینہ کے موقع کو استعمال کرکے اپنی تاریخ بنائی۔ مغربی قومیں صلیبی جنگوں میں اپنے لیے موقع نہ پاسکیں تو انھوں نے علمی مواقع کو استعمال کرکے دوبارہ کامیابی کا مقام حاصل کیا، وغیرہ۔

موجودہ دنیا میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی پہلے موقع کو کھو دیتا ہے۔ کبھی اپنے ناقص تجربہ کی وجہ سے اور کبھی دوسروں کی سرکشی کی وجہ سے۔ مگر پہلے موقع کو کھونے کا مطلب ایک موقع کو کھونا ہے نہ کہ سارے مواقع کو کھونا۔ پہلا موقع کھونے کے بعد اگر آدمی مایوس نہ ہو تو جلد ہی وہ دوسرا موقع پائے گا جس کو استعمال کرکے وہ دوبارہ اپنی منزل پر پہونچ جائے۔

دریافت

دریافت ایک انسانی کمال ہے۔ نئی چیز کی دریافت کسی آدمی کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں ایسے لوگوں کو خصوصی عزت اور احترام حاصل ہوا ہے جنھوں نے انسانی علم میں کسی نئی چیز کا اضافہ کیا ہو۔

دریافت کیا ہے اور کوئی شخص کس طرح ایک دریافت تک پہونچتا ہے، اس کے بارہ میں البرٹ زنٹ گیورگی (Albert Szent-Gyorgyi) کا ایک قول نہایت بامعنی ہے۔ اس کو طبیعیات میں ایک نئی چیز دریافت کرنے پر نوبیل انعام ملا تھا۔ اس سلسلہ میں اس نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ دریافت یہ ہے کہ آدمی اس چیز کو دیکھے جس کو ہر ایک نے دیکھا ہے مگر اس سے وہ ایک ایسے خیال تک پہونچ جائے جس کو کسی نے نہیں سوچا تھا :

Discovery consists of seeing what everybody has seen and thinking what nobody has thought.

دریافت کی اس تشریح کی ایک مشہور مثال نیوٹن کا واقعہ ہے۔ نیوٹن نے سیب کے درخت سے سیب کا ایک پھل نیچے گرتے ہوئے دیکھا۔ پھل کا درخت سے گرنا ایک انتہائی عام واقعہ ہے جس کو ہر شخص جانتا ہے اور ہر شخص نے اس کو دیکھا ہے۔ مگر نیوٹن نے جب اس واقعہ کو گہری نظر سے دیکھا تو اس کو اسی معمولی واقعہ میں ایک غیر معمولی چیز مل گئی۔ یعنی کشش ثقل کے قوانین (Laws of gravity)۔ وہ چیز جس کو ہر ایک نے دیکھا تھا اس میں اس نے وہ چیز پالی جو کسی نے نہیں پایا تھا۔

یہی دریافت تمام اعلیٰ کامیابیوں کا خزانہ ہے۔ وہی شخص بڑی ترقی تک پہونچتا ہے جو کوئی نئی چیز دریافت کرے۔ وہی قوم دوسروں کے مقابلہ میں برتر مقام حاصل کرتی ہے جو دوسروں کے مقابلہ میں کوئی نئی تدبیر ایجاد کر سکے۔ جو لوگ اس تخلیقی صلاحیت کا ثبوت نہ دیں وہ صرف پچھلی صف میں جگہ پاتے ہیں، وہ کبھی اگلی صف میں جگہ پانے والے نہیں بنتے۔

امکان ختم نہیں ہوتا

ایک امریکی نوجوان ڈیوٹ ویلیس (DeWitt Wallace) نے ارادہ کیا کہ وہ ایک ماہانہ ڈائجسٹ نکالے۔ اپنے والد سے اس نے ابتدائی سرمایہ کے طور پر ۳۰۰ ڈالر مانگا۔ مگر والد نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ڈیوٹ پیسہ کو استعمال کرنا نہیں جانتا، وہ اسے ضائع کر دے گا۔ بمشکل اس نے اپنے بھائی سے کچھ رقم حاصل کی اور جنوری ۱۹۲۰ میں نمونہ کا شمارہ چھاپا جو چند سو نسخوں سے زیادہ نہ تھا۔

اب ڈیوٹ کے سامنے دوسرا مسئلہ تھا۔ اس نے اپنا میگزین نیویارک کے پبلشنگ اداروں کو دکھایا اور کہا کہ اس کو فروخت کرنے میں وہ اس کا تعاون کریں۔ مگر تمام اداروں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ میگزین بہت زیادہ سنجیدہ (Too serious) ہے اور اتنے زیادہ سنجیدہ پرچہ کے لیے مارکیٹ موجود نہیں۔

یہ بڑا نازک مسئلہ تھا۔ کیوں کہ اخبارات و رسائل پبلشنگ اداروں ہی کے ذریعہ عوام تک پہونچتے ہیں۔ اور پبلشنگ اداروں نے ڈیوٹ کو تعاون دینے سے انکار کر دیا تھا۔ تاہم ایک امکان بدستور ابھی ڈیوٹ کے لیے باقی تھا۔ وہ یہ کہ وہ خریداروں تک براہِ راست پہونچے۔ اس نے بہت سے پتے حاصل کر کے لوگوں کو براہ راست خطوط لکھے۔ اسی کے ساتھ اس نے اخبارات میں اشتہار شائع کیا۔ عام حالات میں ایک نئے اور غیر معروف میگزین کے لیے اس طرح خریدار حاصل کرنا بظاہر ناممکن تھا۔ مگر ڈیوٹ کی ایک تدبیر نے اس ناممکن کو ممکن بنا دیا۔ اس نے اپنے خطوط اور اپنے اشتہارات میں جو باتیں لکھیں۔ ان میں سے ایک بات یہ تھی:

The subscription could be cancelled and all money refunded if the reader wasn't satisfied (p. 163).

قاری اگر میگزین کو پڑھنے کے بعد اس سے مطمئن نہ ہو تو خریداری ختم کر دی جائے گی اور اس کی پوری رقم اسے واپس کر دی جائے گی۔

اس پیش کش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈیوٹ کے پاس خریداری کی فرمائش اور منی آرڈر آنا شروع ہو گیے۔ پہلے ہی مرحلہ میں اس نے اتنی رقم حاصل کر لی جس سے دو ماہ کا شمارہ بہ آسانی چھاپا جا سکے۔

ڈیوٹ کا منصوبہ کامیاب رہا۔ کسی ایک شخص نے بھی اپنی خریداری ختم نہیں کی۔ کسی نے بھی رقم کی واپسی کا مطالبہ نہیں کیا۔ اس نے عام خریداروں تک پہونچنے کی کوشش کو تیز تر کر دیا۔ فروری ۱۹۲۲ میں اس کا میگزین پانچ ہزار کی تعداد میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد وہ برابر بڑھتا رہا، یہاں تک کہ ۱۹۸۷ میں وہ ۲۸ ملین سے زیادہ تعداد میں دنیا کی پندرہ زبانوں میں ۳۹ اڈیشن شائع کر رہا ہے۔ یہ وہی ماہانہ میگزین ہے جو آج ساری دنیا میں ریڈرز ڈائجسٹ (Reader's Digest) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اب وہ دنیا کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا میگزین بن چکا ہے۔ ۱۹۸۰ میں ڈیوٹ اور اس کی بیوی پچاس ہزار ملین ڈالر کے مالک تھے۔

ڈیوٹ نے اپنے میگزین کے لیے اس طرح خریدار فراہم کیے کہ اس نے اپنے میگزین کو خریداروں کے لیے "مفت" بنا دیا۔ ہر آدمی پیسہ ڈوب جانے کے اندیشہ کے بغیر اس کا خریدار بن سکتا تھا۔ تاہم خود اس تدبیر کو اپنے حق میں استعمال کرنے کے لیے ایک اور تدبیر ضروری تھی۔ اگر یہ دوسری تدبیر موجود نہ ہوتی تو صرف پہلی تدبیر اس کی ناکامی میں اضافہ کے سوا اسے کچھ اور دینے والی ثابت نہ ہوتی۔

یہ دوسری تدبیر وہی تھی جس کو اعلیٰ معیار کہا جاتا ہے۔ یعنی میگزین کو معیار کے اعتبار سے ایسا بنا دینا کہ پڑھنے کے بعد قاری کو وہ واقعۃً پڑھنے کی چیز نظر آئے۔ وہ اس کو دیکھنے کے بعد یہ سمجھے کہ اس کی خریداری کے لیے جو رقم اس نے بھیجی ہے وہ صحیح بھیجی ہے، اور اس کو اپنی خریداری جاری رکھنا چاہیے۔

اپنے میگزین میں یہ دوسری صفت پیدا کرنے کے لیے ڈیوٹ کو غیر معمولی محنت کرنی پڑی۔ اس کا ماہنامہ ایک ڈائجسٹ تھا۔ یعنی مختلف مطبوعہ مضامین کا انتخاب۔ ڈیوٹ یہ منتخب مضامین حاصل کرنے کے لیے روزانہ چالیس سے زیادہ میگزین پڑھتا تھا۔ کچھ خرید کر اور کچھ مختلف لائبریریوں میں جا کر۔ اس پُر مشقت عمل کے لیے ڈیوٹ کو طعن و طنز بھی سننے پڑتے

رازِ حیات

جاپان کے لوگ اپنے آپ کو سورج کی اولاد سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان کی نسل دوسری نسلوں سے برتر ہے۔ انھیں حق ہے کہ وہ دوسری قوموں پر بالاتری حاصل کریں۔ اس ذہن نے ان کے یہاں اس نعرے کی صورت اختیار کی کہ مشرقی ایشیا جاپان کے لیے :

East Asia for Japan

جاپانی قوم کا یہ ذہن اس کی قدیم تاریخ میں اس کو متشدد بنائے ہوئے تھا۔ خاص طور پر ۱۹۲۷ سے لے کر ۱۹۴۵ تک وہ اپنے اس خود ساختہ حق کے لیے دوسری قوموں سے لڑتے رہے اس جنگ میں انھیں ابتداءً کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ مثلاً ۱۹۴۲ میں انھوں نے منیلا پر قبضہ کر لیا اسی طرح سنگاپور، ندرلینڈ اور رنگون ان کے قبضہ میں آگیا۔ مگر آخرکار انھیں زبردست شکست ہوئی۔

دوسری جنگ عظیم میں امریکہ اور جاپان ایک دوسرے کے حریف تھے۔ جاپان کے پاس سادہ بم تھے۔ امریکہ نے اس کے مقابلہ میں جوہری بم تیار کر لیا۔ اب دونوں کے درمیان طاقت کا توازن ٹوٹ گیا۔ جولائی ۱۹۴۵ میں امریکہ نے جاپان کے اوپر دو ایٹم بم گرائے۔ جاپان کی فوجی طاقت تہس نہس ہو گئی۔ امریکہ کو جیت ہوئی اور جاپان کے لیے اس کے سوا کوئی صورت باقی نہ رہی کہ وہ اپنے لیے اس حیثیت کو قبول کرے جس کو ایک مبصر نے ذلت آمیز ہتھیار ڈالنے (Humiliating surrender) سے تعبیر کیا ہے (ٹائم ۱۲ اپریل ۱۹۸۷، صفحہ ۱۵)

اب جاپان نے حقیقت پسندی کا ثبوت دیا۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۵ کو شاہ جاپان ہیرو ہیٹو نے قوم کے نام ایک ریڈیائی پیغام نشر کیا جس میں کہا گیا تھا کہ ہم نے طے کیا ہے کہ آنے والی نسلوں کے لیے عظیم امن کی بنیاد رکھیں۔ اور اس مقصد کے لیے ناقابل برداشت کو برداشت کریں اور اس چیز کو سہیں جو سہنے کے قابل نہیں :

We have resolved to pave the way for a grand peace for all the generations to come by enduring the unendurable and suffering what is unsufferable.

اس فیصلہ کے مطابق جاپان نے ۲ ستمبر ۱۹۴۵ کو اپنی شکست کے کاغذات پر دستخط کر دیئے۔ اس نے جاپان کے اوپر امریکہ کی بالا دستی تسلیم کرلی۔

جاپان کے لیے یہ فیصلہ کوئی معمولی فیصلہ نہ تھا۔ جاپانی قوم اب تک ذاتی برتری کے احساس پر کھڑی ہوئی تھی۔ اب اس کو حقیقت پسندی کے احساس پر کھڑا ہونا تھا۔ اب تک وہ بیرونی مخالف جذبات (Anti-foreign sentiments) میں جی رہی تھی اب اس کو خود احتسابی کے جذبات میں اپنے لیے زندگی کا راز دریافت کرنا تھا۔ اس وقت جاپان کی صورتِ حال یہ تھی کہ اس کی صنعتیں برباد ہو چکی تھیں۔ "جنگی مجرم" جنرل میکارتھر کو معاہدہ کے خلاف جاپان کے اوپر مسلط کر دیا گیا تھا۔ کوریا، برما، سنگاپور، تائیوان اور دوسرے بیرونی مقبوضات کے علاوہ خود اپنے ملک کے کئی علاقے اس نے کھو دیے تھے مثلاً جزیرہ کرافوٹو، اوکی ناوا وغیرہ۔ ۱۹۴۶ میں "میکارتھر کانسٹی ٹیوشن" جاپان میں نافذ کیا گیا جو "بیرونی طاقت کی طرف سے ایک مفتوح قوم کو مکمل طور پر اپنے قبضہ میں" رکھنے کے لیے وضع کیا گیا تھا۔

یہ سب چیزیں بلاشبہ ناقابل برداشت کو برداشت کرنے کے ہم معنی تھیں۔ چنانچہ جاپان کے بہت سے لوگ اس کو برداشت نہ کر سکے اور اس غم میں انھوں نے اپنے آپ کو ہلاک کر لیا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے اس کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ فوجی انتہا پسندوں نے اس بات کی کوشش کی کہ قوم کے نام شاہ جاپان کے ریڈیائی پیغام کو نشر نہ ہونے دیں، اور جب وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے تو متعدد قوم پرستوں اور فوجی افسروں نے بے عزتی کے احساس کے تحت خودکشی کر لی:

> There were a number of suicides among the military officers and nationalists who felt themselves dishonoured (10/86).

جاپان نے حقیقت پسندی کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے اپنے لیے نمبر ۲ کی حیثیت کو قبول کر لیا۔ تاہم اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے دوسری حیثیت پر راضی ہو گیا ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ طاقتور فریق سے ٹکراؤ نہ کرتے ہوئے اپنے لیے تعمیر نو کا وقفہ حاصل کرنا۔ اس پالیسی کے تحت جاپان نے یہ کیا کہ اس نے سیاسی اور معاشی اعتبار سے امریکہ کی بالا دستی کو تسلیم کر لیا۔

اور اپنی تمام توجہات سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں موڑ دیں۔ یہ عمل جاری رہا۔ یہاں تک کہ تیس سال میں تاریخ بدل گئی۔ فوجی اعتبار سے زیردست جاپان نے اقتصادی اعتبار سے بالادست جاپان کی حیثیت حاصل کرلی۔ جاپان نے الکٹرانکس اور دوسرے شعبوں میں اتنی اعلیٰ درجہ کی مصنوعات تیار کیں کہ خود امریکہ کے لوگ اپنے ملک کی چیزیں چھوڑ کر جاپان کی چیزیں خریدنے لگے۔ کیوں کہ وہ کوالٹی میں امریکہ سے بہتر تھیں اور قیمت میں امریکہ سے کم۔ اس صورت حال نے امریکی مدبرین کو سخت پریشان کردیا ہے۔ امریکہ کے ایک سیاسی مدبر مسٹر پیٹی ولسن (Pete Wilson) نے کہا کہ جاپان کے الکٹرانک سامان ٹوکیو کے سوا ہر ایک کو برباد کررہے ہیں:

The Japanese semiconductor Godzilla
is now destroying everything but Tokyo.

دوسری جنگ عظیم کے بعد جاپان امریکہ کا مقروض ہوگیا تھا۔ اب خود امریکہ جاپان کا مقروض بننے لگا۔ ۱۹۸۶ میں امریکہ کا جو سامان جاپان میں آیا ان کی قیمت ۲۶ بلین ڈالر تھی۔ اس کے مقابلہ میں جاپان کا سامان جو امریکہ گیا ان کی قیمت ۸۵ بلین ڈالر ہے۔ اس طرح امریکہ اور جاپان کے درمیان تجارتی توازن ٹوٹ گیا۔ ۱۹۸۶ میں امریکہ کے مقابلہ میں جاپان کا ٹریڈ سرپلس ۸۵ بلین ڈالر سے زیادہ تک پہونچ گیا۔ امریکہ آج دنیا کا سب سے بڑا مقروض ملک ہے اور جاپان دنیا کا سب سے بڑا مہاجن ملک۔ (ٹائم ۱۳ اپریل، ۲۷ اپریل ۱۹۸۷)

اس صورت حال پر آج کل کثرت سے کتابیں شائع ہورہی ہیں۔ امریکہ میں ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام ہے جاپان نمبر ایک (JAPAN-Number One) یہ کتاب اس وقت امریکہ میں سب سے زیادہ بکنے والی کتاب بنی ہوئی ہے۔ ۱۹۴۵ میں جاپان نے امریکہ کے مقابلہ میں نمبر ۲ کی حیثیت منظور کرلی تھی۔ ۴۰ سال بعد خود امریکہ کو اعتراف کرنا پڑا کہ جاپان دوبارہ نمبر ایک کا مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا ہے۔

جاپانیوں نے اپنے ہاتھ سے "جاپان نمبر ۲" کی کتاب لکھی، اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوا کہ دوسرے لوگ ان کے بارہ میں ایسی کتاب لکھیں جس کا نام "جاپان نمبر ایک" ہو۔ یہی موجودہ دنیا کا قانون ہے۔ یہاں جو لوگ ہار مان لیں وہی جیتتے ہیں۔ یہاں جو لوگ پیچھے ہٹنے پر راضی

ہوجائیں ۔ وہی دوبارہ اگلی صف میں جگہ پاتے ہیں۔ اس راز کو چودہ سوسال پہلے مسلمانوں نے "صلح حدیبیہ" کی صورت میں دریافت کیا تھا، موجودہ زمانہ میں جاپانیوں نے اسی کو اپنے حالات کے لحاظ سے اپنی زندگی میں دہرایا ہے ۔

اصل یہ ہے کہ یہ دنیا مقابلہ اور مسابقت کی دنیا ہے ۔ یہاں ہر ایک دوڑ رہا ہے ، یہاں ہر ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانا چاہتا ہے ۔ یہی مقابلہ انسانی ترقیوں کا زینہ ہے ۔ تاریخ کی تمام ترقیاں اسی مقابلہ آرائی کے بطن سے ظاہر ہوئی ہیں۔ امریکہ کی قیادتی کوشش کے ذریعہ انسان جوہری طاقت تک پہونچا۔ جاپان کے دوبارہ اٹھنے کی کوشش نے الکٹرانک دور پیدا کر دیا ، وغیرہ ۔

اس دوڑ یا مقابلہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بار بار ایک قوم دوسری قوم سے پچھڑ جاتی ہے ۔ بار بار کوئی آگے بڑھ جاتا ہے اور کوئی پیچھے رہ جاتا ہے ۔ ایسی حالت میں پیچھے رہ جانے والا اگر شکایت اور احتجاج میں لگ جائے تو وہ صرف اپنا وقت ضائع کرے گا۔ اس کے لیے واحد راستہ صرف یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کا اعتراف کرے کہ دوسرے اس سے آگے بڑھ گیے اور وہ دوسروں سے پیچھے رہ گیا ۔

یہ اعتراف اس کی کوششوں کو صحیح رُخ پر لگا دے گا۔ وہ اس کو موقع دے گا کہ آگے بڑھنے والے سے بے فائدہ ٹکراؤ کیے بغیر وہ اپنی تعمیر ثانی کا کام شروع کر دے ۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ آئے جب کہ وہ اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کر لے ۔

اپنے پیچھے ہونے کا احساس آدمی کو دوبارہ آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتا ہے ۔ پیچھے رہ جانے والا شخص اگر اپنے پیچھے ہونے کا اقرار نہ کرے تو وہ ہمیشہ پیچھے ہی پڑا رہے گا ، دوبارہ آگے بڑھنا اس کے لیے مقدر نہیں ۔

محرومی پر راضی ہونا

نماز مسلمانوں پر اول دن سے فرض تھی۔ مگر پانچ وقت کی قید کے ساتھ نماز معراج میں فرض کی گئی۔ ہجرت کے بعد مدینہ میں باقاعدہ طور پر باجماعت نماز کا قیام عمل میں آیا۔ ابتدا میں یہ معمول تھا کہ جب نماز کا وقت آتا تو لوگ اپنے آپ مسجد میں آجاتے۔ مگر جماعت کے باقاعدہ نظام کے لیے ضروری تھا کہ اس کے اعلان کا انتظام کیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارہ میں لوگوں سے مشورہ فرمایا۔ کسی نے کہا کہ ناقوس بجایا جائے، کسی نے کہا کہ اونچی جگہ پر آگ روشن کی جائے۔ اس طرح کے اور بھی بعض مشورے سامنے آئے مگر ان میں سے کسی کو آپ نے قبول نہیں فرمایا۔

اس کے بعد ایک صحابی کو اذان کے کلمات کی بشارت ہوئی۔ یہ عبداللہ بن زید بن ثعلبہ بن عبدربہ تھے۔ انھوں نے خواب میں دیکھا کہ ایک سبز پوش آدمی ہے۔ اس سے وہ اذان کے بارہ میں گفتگو کر رہے ہیں۔ وہ آدمی ان کو بتاتا ہے کہ اس کی بہتر تدبیر یہ ہے کہ تم یہ الفاظ کہو۔ اس کے بعد اس آدمی نے اللہ اکبر سے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ تک وہ تمام الفاظ بتائے جو اب نماز سے پہلے ہر مسجد سے بہ آواز بلند پکارے جاتے ہیں۔ مذکورہ صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور اپنا پورا خواب بیان کیا۔ آپ نے اس کو پسند کیا اور فرمایا کہ بے شک یہ سچا خواب ہے، (اِنّھا لرؤیا حقٌّ ان شاء اللّٰہ، سیرۃ ابن ہشام، جلد ۲، صفحہ ۱۲۹)

قدرتی طور پر عبداللہ بن زید کی خواہش تھی کہ وہی موذن مقرر کیے جائیں۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بجائے حضرت بلال کو موذن مقرر فرمایا اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ وہ تم سے زیادہ بلند آواز ہیں (فانہ اندی صوتاً منک) عبداللہ بن زید یہ سوچ سکتے تھے کہ مجھے اذان کی بشارت ہوئی ہے، اس لیے میرا حق ہے کہ میں ہی اذان دینے والا بنوں۔ مگر اذان کا مقصد اعلان تھا اس لیے اونچی آواز والے شخص کو مقرر کیا گیا۔ عبداللہ بن زید نے اس محرومی کو گوارا کرلیا۔ یہی کامیابی کا راز ہے۔ اس دنیا میں اسی گروہ کے لیے کامیابی کی راہیں کھلتی ہیں جس کے افراد اہل تر کے مقابلہ میں اپنے حق سے دست بردار ہو جائیں۔

غلط فہمی

ابوجعفر محمد بن جریر بن یزید الطبری (۸۳۹ - ۹۲۳) مشہور عالم ہیں۔ وہ ایران میں پیدا ہوئے۔ مختلف ممالک میں تحصیل علم کے بعد بغداد میں مقیم ہو گیے اور یہیں وفات پائی۔ ان کی کتابوں میں سے دو کتابیں بہت مشہور ہیں۔ تفسیر میں جامع البیان عن تاویل آی القرآن اور تاریخ میں تاریخ الامم والملوک۔ دولت سامانیہ کے شہزادہ منصور بن نوح نے ان کی وفات کے چالیس سال بعد ان کی تاریخ کی کتاب کا فارسی ترجمہ (۹۶۳ء) تیار کرایا تھا۔

ابن جریر طبری مسلمہ طور پر ایک عظیم اسلامی عالم تھے۔ خطیب بغدادی (م ۴۶۳ھ) نے لکھا ہے کہ اقوام و ملوک کی تاریخ پر ان کی مشہور کتاب ہے، اور تفسیر قرآن پر ایک کتاب ہے جس کے مثل کتاب ابھی تک کسی نے نہیں لکھی (ولہ الکتاب المشہور فی تاریخ الامم والملوک وکتاب فی التفسیر ولم یصنف احد مثلہ) مگر ۲۸ شوال ۳۱۰ھ کو جب ابن جریر طبری کا بغداد میں انتقال ہوا تو حنبلی علمار کی شدید مخالفت کی وجہ سے ان کو مسلمانوں کے عام قبرستان میں جگہ نہیں ملی۔ انتقال کے اگلے روز وہ اپنے مکان ہی کے ایک حصہ میں دفن کر دیے گیے۔

امام محمد بن جریر طبری کا یہ انجام کیوں ہوا۔ اس کی وجہ ایک بدگمانی تھی جو بلا تحقیق ان کی طرف منسوب کر دی گئی اور بڑھتے بڑھتے اپنی آخری حد پر پہونچ گئی۔ اصل یہ ہے کہ اسی زمانہ میں ایران میں ایک اور صاحب تھے جن کا نام محمد بن جریر بن رستم ابوجعفر الطبری تھا۔ یہ شیعہ عالم تھے۔ شیعی مسلک کے مطابق ان کا کہنا تھا کہ وضو میں پاؤں کا دھونا ضروری نہیں ہے۔ صرف مسح بھی کافی ہے۔ نام کے جزئی اشتراک کی بنا پر کچھ لوگوں نے اس کو ابوجعفر محمد بن جریر بن یزید الطبری کا مسلک سمجھ لیا، حالانکہ وہ محمد بن جریر بن رستم ابوجعفر الطبری کا مسلک تھا۔ اس غلط فہمی کی بنا پر متشدد علمار (مثلاً ابوبکر محمد بن داؤد ظاہری) نے ان کو رافضی کہنا شروع کر دیا۔ حالاں کہ امام ابن جریر طبری کا رفض اور شیعیت سے کوئی تعلق نہیں۔

شریعت یا مصلحت

قال علی رضی اللہ عنہ : ماترک الناس شیئاً من امر دینھم لاستصلاح دنیاھم الافتح اللہ علیھم ماھو اضر منہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب بھی لوگ اپنی دنیا بنانے کے لیے اپنے دین کی کسی بات کو چھوڑیں گے تو اللہ ان پر ایسا دروازہ کھول دے گا جو اس سے بھی زیادہ نقصان والا ہو۔

حضرت علی رضؓ کے اس قول کا تعلق تمام معاملات سے ہے، خواہ وہ چھوٹا معاملہ ہو یا بڑا معاملہ۔ خواہ اس کا تعلق انفرادی امور سے ہو یا قومی امور سے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ جب کسی معاملہ میں قرآن وسنت کی ایک ہدایت موجود ہو تو وہ کسی اندیشہ کے بغیر اس کو پکڑ لیں۔ قرآن وسنت کی ہدایت سامنے آجانے کے بعد ہر دوسری مصلحت باطل ہے۔ خواہ وہ بظاہر کتنی ہی زیادہ اہم دکھائی دیتی ہو۔

مثلاً ہندستان میں جو فرقہ وارانہ جھگڑے ہیں ان میں واضح طور پر قرآن وسنت کی رہنمائی یہ ہے کہ ان سے اعراض کیا جائے اور اشتعال کے باوجود مشتعل نہ ہونے کی پالیسی اختیار کی جائے۔ مگر قرآن وسنت کی یہ ثابت شدہ تعلیمات جب مسلمانوں کے سامنے پیش کی جاتی ہیں تو وہ ایک خود ساختہ مصلحت کی بنا پر ان کو اختیار نہیں کر پاتے۔ وہ مصلحت یہ ہے کہ اگر ہم جوابی عمل نہ کریں تو فریق ثانی دلیر ہو جائے گا اور پہلے سے زیادہ شرارتیں کرے گا۔

اس ملک کے مسلمان پچھلی نصف صدی سے اسی خود ساختہ طریقہ پر عمل کر رہے ہیں۔ مگر نتیجہ بتاتا ہے کہ ان کے حق میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مذکورہ الفاظ صادق آرہے ہیں۔ وہ مصلحتِ قومی کی خاطر دین کی تعلیم کو چھوڑتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ شدید تر فساد برپا ہوتا ہے جو ان کے قومی مفاد کو پہلے سے بھی زیادہ تباہ وبرباد کر دیتا ہے۔

خدا ورسول کو زیادہ بہتر طور پر یہ معلوم ہے کہ کون سا رویہ ہمارے لیے مفید ہے اور کون سا رویہ ہم کو نقصان پہونچانے والا ہے۔ ایسی حالت میں یہ خدا ورسول کے خلاف عدم اعتماد کا اظہار ہے کہ خدا ورسول کی رہنمائی سامنے آنے کے بعد آدمی یہ سمجھے کہ کسی اور طریقہ کو اختیار کرکے وہ زیادہ فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔

انسان کدھر

نئی دہلی کے انگریزی اخبار انڈین اکسپریس (۲۸ جنوری ۱۹۸۷) کے صفحہ اول پر ایک باتصویر خبر شائع ہوئی ہے۔ یہ ایک مجرم کی خودکشی کی خبر ہے۔ اس میں اوپر نیچے ایک آدمی کی تین تصویریں ہیں۔ اور اس کے نیچے یہ الفاظ درج ہیں :

ESCAPE THROUGH DEATH: The Pennsylvania State Treasurer, Mr R. Budd Dwyer, who was convicted by a federal court of conspiracy for bribery, points a pistol into his mouth (top), pulls the trigger (centre) and slumps on the floor (bottom) during a new conference in his office in Harrisburg, USA, before he could be sentenced last Thursday. (AP)

فرار بذریعہ موت ـــــ پنسلوانیا (امریکہ) کے سرکاری خزانچی، مسٹر آر بڈ ڈائرجن کو فیڈرل کورٹ نے رشوت کے لیے سازش کے معاملہ میں ملزم ٹھہرایا تھا، وہ اپنے منھ میں ایک پستول ڈالے ہوئے ہیں (اوپر کی تصویر) وہ پستول چلا دیتے ہیں (بیچ کی تصویر) اور پھر وہ فرش پر گر پڑتے ہیں (نیچے کی تصویر)۔ یہ واقعہ ہیرسبرگ (امریکہ) میں ان کے آفس کے اندر ایک اخباری کانفرنس کے دوران اس سے پہلے پیش آیا جب کہ وہ ۲۲ جنوری کو سزا دیے جانے والے تھے۔

اخبار نے اس خبر پر "موت کے ذریعہ فرار" کی سرخی قائم کی ہے۔ لیکن زندگی کی اصل حقیقت کے اعتبار سے دیکھیے تو اس کی زیادہ صحیح سرخی یہ ہوگی : چھوٹی سزا سے بڑی سزا کی طرف فرار۔

موت زندگی کا خاتمہ نہیں، وہ ایک زندگی سے دوسری زندگی کی طرف جانے کا دروازہ ہے۔ یہ امتحان کے دور سے نکل کر انجام کے دور میں داخل ہونا ہے۔ کوئی انسان خودکشی کرکے اپنی امتحانی مدت کو کم کر سکتا ہے۔ مگر یہ اس کے بس میں نہیں کہ وہ انجام کی دنیا میں داخل ہونے سے اپنے آپ کو بچالے۔ آدمی اگر اس حقیقت کو جانے تو اس کے عمل کا رُخ کچھ سے کچھ ہو جائے گا۔ وہ آزاد زندگی کو چھوڑ کر پابند زندگی گزارے گا۔ وہ خودکشی کے بجائے خود احتسابی کا طریقہ اپنائے گا۔ وہ انسان کی پکڑ سے زیادہ خدا کی پکڑ سے ڈرنے لگے گا۔

بڑا اندیشہ

ڈاکٹر ڈینس بریو (Dennis Breo) نے ان طبی ماہرین سے ملاقاتیں کیں اور ان کا انٹرویو لیا جو مشہور شخصیتوں کے معالج رہے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے ایک کتاب شائع کی جس کا نام ہے غیر معمولی احتیاط (Extraordinary Care)۔ اس کتاب میں مصنف نے بڑے عجیب انکشافات کیے ہیں۔

انھوں نے لکھا ہے کہ مشہور شخصیتیں اکثر ناممکن مریض (Impossible patients) ثابت ہوتی ہیں۔ مثلاً ہٹلر کو ایک جلدی مرض تھا مگر اس نے اس بات کو اپنے لیے فروتر سمجھا کہ ڈاکٹر کے سامنے وہ اپنا کپڑا اتارے۔ چنانچہ صحیح طور پر اس کا علاج نہ ہو سکا۔ مشہور امریکی دولت مند ہوورڈ ہیوز (Howard Hughes) کا دانت خراب تھا مگر اس نے کبھی ڈاکٹر کے سامنے اپنا منھ نہیں کھولا۔ اس نے اس کو پسند کیا کہ وہ شراب پی کر اپنی تکلیف بھلاتا رہے۔ وغیرہ

شاہ ایران کے بارہ میں مصنف نے بتایا ہے کہ وہ فساد خون کے مریض تھے۔ مگر انھوں نے ڈاکٹروں سے اس کا علاج کرانے سے انکار کر دیا۔ کیوں کہ انھوں نے محسوس کیا کہ یہ چیز انھیں سیاسی طور پر کمزور کر دے گی:

The Shah of Iran refused to be treated for his leukemia because he felt it would weaken him politically.
The Times of India, March 19, 1987, p. 7

شاہ ایران نے فساد خون کو اپنی حکومت کے لیے خطرہ سمجھا۔ حالانکہ بعد کے واقعات نے بتایا کہ فساد سیاست ان کی حکومت کے لیے زیادہ بڑا خطرہ تھا۔ ان کے اقتدار کو جس چیز نے ختم کیا وہ فساد خون کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ فساد سیاست کا مسئلہ تھا۔ وہ بڑے خطرے سے غافل رہے، اور اپنی ساری توجہ چھوٹے خطروں میں لگا دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عین اس وقت ان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا جب کہ اپنے نزدیک وہ اس کو بچانے کا پورا اہتمام کر چکے تھے۔

چھوٹے اندیشوں کی فکر کرنا اور بڑے اندیشوں سے غافل رہنا، یہی اکثر انسانوں کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب ہے، خواہ وہ مشہور لوگ ہوں یا غیر مشہور لوگ۔

اعمال کے نتائج

ایک حدیث قدسی کے مطابق اللہ تعالی نے فرمایا کہ زمانہ کو برا نہ کہو۔ زمانہ تو میں ہوں۔ سارا معاملہ میرے ہاتھ میں ہے اور میں ہی رات اور دن کو الٹتا پلٹتا رہتا ہوں (لَا تَسُبُّوا الدَّهْرَ وَأَنَا الدَّهْرُ بِيَدِيَ الْأَمْرُ أُقَلِّبُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ) اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے قانون خداوندی کے مطابق ہوتا ہے۔ خدا ہی کے قانون کے مطابق حالات پیدا ہوتے ہیں اور خدا ہی کے حکم کے مطابق زمانہ گردش کرتا ہے۔ ایسی صورت میں زمانہ یا حالات کو برا کہنا خود حکم خداوندی کو برا کہنا ہے۔ ایسا کہنا بے فائدہ ہے اور اسی کے ساتھ سرکشی بھی۔

نادر شاہ ایرانی نہایت ظالم بادشاہ تھا۔ اس نے ۱۷۳۹ میں دہلی پر حملہ کیا۔ دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد اس نے اپنی فوج کو حکم دیدیا کہ جو بھی ملے اس کو قتل کر دو۔ اس قتل عام میں ۳۰۰۰۰ لوگ مارے گیے۔ اس کے بعد اس نے شہر کو لوٹنے کا حکم دیا۔ ۲۶ مئی ۱۷۳۹ کو جب وہ دہلی سے واپس ہوا تو اس کے ساتھ لوٹ کا جو مال تھا اس کی مقدار تیس کرور روپیے تھی۔ سونے، چاندی اور جواہرات اس کے علاوہ تھے۔ شاہ جہاں کا بنوایا ہوا تخت طاؤس بھی اسی موقع پر وہ اپنے ساتھ ایران لے گیا۔ (۹/۳۸۵)

کہا جاتا ہے کہ دہلی والوں پر جب یہ مصیبت اور تباہی آئی تو کچھ لوگ مرزا مظہر جان جاناں کے پاس گیے اور کہا کہ آپ اللہ سے دعا کریں کہ وہ ہم کو نادر شاہ کے اس عذاب سے نجات دے۔ مرزا صاحب نے جواب دیا: شامتِ اعمالِ ما صورتِ نادر گرفت

کسی قوم میں جب اخلاقی بگاڑ آتا ہے تو اس کی عملی طاقت بھی کمزور ہو جاتی ہے۔ اس کے اندر اختلافات ابھرتے ہیں جو اس کی اجتماعی قوت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ اس کے اندر یہ مزاج پیدا ہوتا ہے کہ وہ انفرادی مفاد پر اجتماعی مفاد کو قربان کر دے۔ اپنی ذات سے بلند مقاصد کے لیے قربانیاں دینے کا حوصلہ اس کے اندر باقی نہیں رہتا۔ اس کے افراد بے اصول انسانوں کی ایک بھیڑ بن کر رہ جاتے ہیں۔ وہ سچائی کے آگے جھکنے کے بجائے طاقت کے آگے جھکنے والے بن جاتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں کسی قوم کے لیے اسی طرح مہلک ہیں جس طرح لکڑی کے لیے گھن۔ جس لکڑی کو گھن لگ جائے وہ کھڑی نہیں رہ سکتی، اسی طرح جس قوم کے اندر یہ کمزوریاں پیدا ہو جائیں وہ تباہی اور بربادی سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔

فرقہ واریت کا مسئلہ

فرقہ وارانہ مسئلہ کا حل اتنا ہی آسان ہے جتنا خاندانی مسئلہ کا حل آسان ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر خاندان یک جہتی کے ساتھ زندگی گزار رہا ہے۔ اسی طرح مختلف فرقے بھی یک جہتی کے ساتھ زندگی گزار سکتے ہیں۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ خاندان کے مختلف افراد جس اصول کے تحت باہم مل کر رہتے ہیں۔ اسی طــرح ملک کے مختلف فرقے بھی باہم مل کر رہنا سیکھ جائیں۔ جو اصول آج بھی خاندان کی اجتماعی زندگی میں عملاً رائج ہے اسی اصول کو خاندان سے باہر کی اجتماعی زندگی میں بھی رائج کر دیا جائے۔ یہی کامیابی کا واحد راستہ ہے، خاندان کے اندر بھی اور خاندان کے باہر بھی۔

فرقہ وارانہ مسئلہ بڑے پیمانہ پر عین اسی چیز کا نام ہے جس کو چھوٹے پیمانہ پر خاندانی مسئلہ کہا جاتا ہے۔ خاندانی مسائل مختلف رشتہ داروں کے درمیان پیدا ہوتے ہیں اور فرقہ وارانہ مسائل مختلف فرقوں کے درمیان۔ گھر ایک چھوٹا خاندان ہے اور ملک اس کے مقابلہ میں بڑا خاندان۔ ایک اور دوسرے میں جو فرق ہے وہ صرف ڈگری کا فرق ہے ورنہ نوعیت کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

ہر آدمی جانتا ہے کہ خاندان کے اندر مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ ایک رشتہ دار اور دوسرے رشتہ دار کے درمیان ناخوش گواریاں ظہور میں آتی ہیں۔ ایک کو دوسرے سے قولی یا عملی تکلیف پہونچتی ہے۔ اس کے باوجود کوئی چیز ہے جو خاندان کے مختلف افراد کو باہم جوڑے رکھتی ہے اور ان کو منتشر ہونے سے بچاتی ہے۔ خاندانی اتحاد اور یک جہتی کا جو راز ہے وہی قومی اتحاد اور یک جہتی کا راز بھی ہے۔ ہر شخص کو اپنے خاندان کی سطح پر جو تجربہ پیش آ رہا ہے اسی تجربہ کے بہترین سبق کو وہ ملکی افراد کے معاملہ میں استعمال کرے اور پھر کبھی فساد نہیں ہوگا۔

ہر عقل مند آدمی جانتا ہے کہ خاندانی مسائل کا سادہ حل یہ ہے کہ خاندان کے اندر ایک دوسرے کا لحاظ کرنے کی فضا پائی جائے۔ جب کوئی مسئلہ پیش آئے تو آدمی مشتعل نہ ہو بلکہ اس پر ٹھنڈے طریقہ سے غور کرے۔ وہ مسئلہ کو الجھانے کے بجائے سلجھانا چاہے۔ وہ مسئلہ کو تعلقات کا خاتمہ نہ سمجھے بلکہ درمیانی مدت کا ایک وقتی واقعہ سمجھ کر اس سے گزر جائے۔

یہ ذہن خاندان کے افراد کے اندر برداشت کا مزاج پیدا کرتا ہے۔ اور برداشت تمام اختلافات کا واحد یقینی حل ہے۔ ایک دانش مند باپ جو ایک خاندان کا سربراہ ہو، وہ اپنے گھر والوں کو ہمیشہ یہ سبق دیتا ہے کہ تم لوگ ایک دوسرے کا احترام کرو۔ تم ایک دوسرے کے کام آنے کی کوشش کرو۔ ایک آدمی صرف اپنے حقوق کو یاد نہ رکھے بلکہ وہ اپنے فرائض کو بھی پوری طرح ادا کرنے کی کوشش کرے۔ خاندان کے کسی فرد سے اگر کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو دوسرے لوگ اسے سنبھالیں اور اس سے درگذر کریں۔

یہی خاندانی یک جہتی کا راز ہے اور یہی قومی یک جہتی کا راز بھی۔ تمام فرقہ وارانہ جھگڑے صرف اس لیے پیدا ہوتے ہیں کہ لوگوں نے اپنے خاندان کی سطح پر زندگی کا جو راز سیکھا تھا اس کو انھوں نے فرقہ وارانہ معاملہ میں استعمال نہیں کیا۔

فرقہ وارانہ جھگڑوں کی واحد وجہ یہ ہے کہ لوگ گھر کے معاملات میں جتنے سنجیدہ ہیں، وہ گھر کے باہر کے معاملات میں اتنے سنجیدہ نہیں۔ گھر کے اندر ہر روز ناموافق باتیں پیش آتی ہیں اور ہر آدمی ان کو برداشت کرتا ہے، صرف اس لیے کہ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کا گھر اجڑ جائے گا۔ مگر اسی قسم کا ایک ناخوش گوار معاملہ گھر کے باہر پیش آجائے تو لوگ فوراً بگڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ فرقہ وارانہ مسائل کا واحد حل یہ ہے کہ لوگوں کے اندر سے اس دو عملی کو ختم کر دیا جائے۔

مجھے یاد ہے کہ میرے بچپن میں ایک صاحب تھے۔ وہ اپنے رشتہ داروں کو ہمیشہ ایک شعر سنایا کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ بس یہ ایک شعر پکڑ لو اور اس کے بعد تمہارے تمام گھریلو مسائل اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔ وہ شعر یہ تھا:

کبھی بھول کر کسی سے نہ کرو سلوک ایسا — کہ جو تم سے کوئی کرتا تمہیں ناگوار ہوتا

اس شعر میں ایک حدیث کے مفہوم کو منظوم انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اور بلاشبہ یہ کامیاب اجتماعی زندگی کا سب سے بڑا اصول ہے۔ اگر لوگ اس ایک ہدایت کو پکڑ لیں تو ان کے تمام مسائل حل ہو جائیں، خواہ وہ گھر کے اندر کے مسائل ہوں یا گھر کے باہر کے مسائل۔

مسٹر الف اور مسٹر ب دونوں ایک محلہ میں رہتے تھے۔ مسٹر الف کے لڑکے نے مسٹر ب کے لڑکے کے ساتھ ایک نازیبا حرکت کی اور اس کو غصہ دلا دیا۔ اس کے جواب میں مسٹر ب کے لڑکے

نے مسٹر الف کے لڑکے کو مارا۔ اب مسٹر الف باہر آئے اور مسٹر ب کے گھر والوں کو انسانیت کے ساتھ رہنے کی تلقین شروع کر دی۔ انھوں نے اپنے لڑکے کو کچھ نہیں کہا۔ پوری ذمہ داری مسٹر ب کے لڑکے پر ڈالتے ہوئے یک طرفہ طور پر مسٹر ب کو انسانیت کے ساتھ رہنے کی تلقین کرتے رہے۔

مسٹر الف کے وعظ کو اگر پس منظر سے الگ کرکے دیکھا جائے تو وہ ایک درست بات معلوم ہوگی۔ لیکن اگر اس کو پس منظر میں رکھ کر دیکھا جائے تو وہ سراسر ایک غلط بات ہے۔ ایسی صورتِ حال میں اپنے لڑکے کو کچھ نہ کہنا اس کی نازیبا حرکتوں پر اس کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔ یہ دوسرے کے لڑکے کے لیے اگر پیامِ انسانیت ہے تو اپنے لڑکے کے لیے پیامِ شرارت۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ اکثر لوگ معاملات کو اپنے اور غیر کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اپنے آدمی کی غلطی ہو تو اس کو گھٹاتے ہیں، اور اپنے سے باہر کا آدمی غلطی کر دے تو اس کو خوب بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ بس یہی دو عملی سارے فساد کی جڑ ہے۔ اگر لوگوں کے اندر یہ مزاج آجائے کہ وہ معاملات کو انصاف کی نظر سے دیکھیں۔ وہ اپنوں کے معاملہ میں نرمی کا جو طریقہ اختیار کرتے ہیں، وہی نرم طریقہ غیروں کے معاملہ میں بھی اختیار کریں تو کبھی کوئی جھگڑا نہ ہو۔ اس کے بعد تمام شر و فساد اپنے آپ ختم ہو جائے۔

حال میں میری ملاقات ایک شخص سے ہوئی جو تیس سال سے تجارت کرتے ہیں۔ اور آجکل جدہ میں ہیں۔ وہ اپنی تجارت میں نہایت کامیاب ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ نے زندگی کا بہت تجربہ اٹھایا ہے اور بہت سے ملکوں کا سفر کیا ہے۔ یہ بتائیے کہ لوگوں کے درمیان کامیاب زندگی گزارنے کا راز کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس کا راز وہی ہے جس کو قرآن میں اعراض کہا گیا ہے۔ یعنی ناموافق باتوں سے ٹکرانے کے بجائے ان کو نظر انداز کرنا۔ انھوں نے کہا کہ میں ہمیشہ ٹکراؤ کے موقع پر یک طرفہ طور پر پیچھے ہٹنے کے لیے تیار رہتا ہوں۔ اس لیے میرا راستہ کبھی کھوٹا نہیں ہوتا۔ میرے لیے کوئی رکاوٹ رکاوٹ ثابت نہیں ہوتی۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اپنے بہت سے واقعات بتائے۔

مثلاً انھوں نے کہا کہ ایک شخص کسی بات پر مجھ سے بگڑ گیا۔ اگلے دن وہ میرے پاس آیا اور مجھ کو بری طرح گالیاں دینے لگا۔ اس نے مجھے زبردست دھمکیاں دیں۔ میں خاموش سنتا رہا۔ اس کے بعد میں نے کہا۔ تم کو جو کرنا ہو کرو۔ مگر جان لو کہ میرے پاس بھی ایک حربہ ہے۔ اس نے

غصہ کے ساتھ پوچھا کہ وہ کیا حربہ ہے۔ میں نے کہا کہ تم جتنا زیادہ مجھے گالیاں دو گے میں اتنا ہی زیادہ تم کو دعائیں دوں گا۔ تم جتنا زیادہ مجھ کو دباؤ گے میں اتنا ہی زیادہ جھکتا چلاؤں گا۔ میری یہ بات سن کر اس کا سارا جوش ختم ہو گیا۔ وہ چپ چاپ واپس چلا گیا اور پھر کبھی میرے خلاف کوئی بات نہیں کی۔

انھوں نے مزید کہا کہ اس پالیسی کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہے کہ میں غیر ضروری نقصانات سے بچ جاتا ہوں۔ اس کا مزید فائدہ یہ ہے کہ میرے اندر بے پناہ جرأت آگئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ دوسروں سے نفرت آدمی کو بزدل بناتی ہے۔ اور دوسروں سے محبت آدمی کو بہادر بنا دیتی ہے۔ اور بلاشبہ یہ نہایت سچی بات ہے۔

ہندستان کے حالات میں فرقہ وارانہ مسئلہ کی سب سے بڑی نفسیاتی وجہ شک وشبہہ ہے۔ مختلف تاریخی اسباب سے یہاں ایک دوسرے کے خلاف غیر ضروری قسم کے شبہات کی فضا پیدا ہو گئی ہے۔ ان شبہات کو پھاڑ کر باہر آجائیے اور پھر تمام فرقہ وارانہ مسائل آپ کو فضا میں تحلیل ہوتے ہوئے نظر آئیں گے۔

ایک مرتبہ میں ہوائی جہاز سے یورپ کے ایک مقام کا سفر کر رہا تھا۔ ہوائی اڈہ پر پہونچا تو اس قدر کہر چھایا ہوا تھا کہ سورج دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کہر کی حالت میں ہمارا جہاز اوپر بلند ہوا۔ کچھ دیر تک تو چاروں طرف اندھیرے کی وہی کیفیت رہی جو ہوائی اڈہ پر نظر آرہی تھی۔ مگر جب جہاز اپنی پوری بلندی پر پہونچ گیا تو میں نے جہاز کی کھڑکی سے دیکھا کہ سورج کی روشنی پورے آب وتاب کے ساتھ چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ ایسا ہی کچھ معاملہ شبہات کا ہے۔ ہم اکثر شبہات کے کہر میں گھر کر سوچتے ہیں۔ ہم بھول جاتے ہیں کہ شبہات کا دائرہ ایک مصنوعی اور محدود دائرہ ہے۔ اگر ہم تھوڑی سی کوشش کر کے اس دائرہ کے باہر آجائیں تو ہر طرف ہم کو یقین اور اطمینان کا سورج چمکتا ہوا نظر آنے لگے گا۔

مجھے ایک شہر کا حال معلوم ہے۔ وہاں ہر سال ایک فرقہ کا جلوس نکلتا ہے جو دوسرے فرقہ کی عبادت گاہ سے گزرتا ہے۔ عبادت گاہ کے پاس پہونچ کر جلوس چھ گھنٹہ اور آٹھ گھنٹہ تک رکا رہتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عبادت گاہ کے لوگ روک ٹوک کرتے اور یہ کہتے کہ جلوس

کو دوسرے راستے سے لے جاؤ۔ اس طرح بات بڑھتی اور ضد کی فضا پیدا ہو جاتی، یہاں تک کہ فساد ہو جاتا۔ پچھلے سال عبادت گاہ کے لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ جلوس کے خلاف کوئی روک ٹوک نہ کریں گے۔ چنانچہ جلوس حسب سابق آیا تو وہاں دوسرے فرقہ کا کوئی آدمی اسے روکنے کے لیے موجود نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جلوس صرف آدھ گھنٹہ میں گزر گیا اور کسی قسم کا کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ ضد کے جواب میں ہمیشہ ضد پیدا ہوتی ہے۔ اگر آپ ضد نہ کریں تو دوسرے کی ضد اپنے آپ ختم ہو جائے گی۔

اسی طرح میں ایک شہر کے بارے میں جانتا ہوں جہاں دو مسجدیں ہیں۔ اور دونوں بہت پہلے سے آثار قدیمہ کے قبضہ میں تھیں۔ ان میں سے ایک مسجد بہت چھوٹی مسجد ہے اور دوسری مسجد اس کے مقابلہ میں دس گنا زیادہ بڑی ہے۔ بڑی مسجد پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا جب کہ چھوٹی مسجد پر ابھی تک جھگڑا چل رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چھوٹی مسجد کو کچھ موقع پرست لیڈروں نے جلسہ جلوس کا مسئلہ بنا دیا۔ اس کے نتیجہ میں وہ دونوں فرقوں کے لیے ساکھ کا مسئلہ بن گیا اور اس کی بازیابی کی راہ میں سیاسی نزاکتیں پیدا ہو گئیں۔

اس کے برعکس بڑی مسجد کا معاملہ لیڈروں تک نہیں پہونچا۔ وہ مقامی طور پر غیر معروف مسلمانوں کے ہاتھ میں رہا جنھوں نے اس کی بازیابی کے لیے انفرادی سطح پر کوششیں کیں۔ یہ کوشش چونکہ غیر سیاسی انداز میں تھی، اس میں انھیں دوسرے فرقہ کا تعاون بھی حاصل ہوا۔ یہاں تک کہ مسجد اور اس سے ملحق وسیع زمین مسلمانوں کے قبضہ میں آگئی۔ میں نے خود جاکر اس مسجد اور اس کے علاقہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہاں اب مسجد اور مدرسہ قائم ہے۔ بجلی اور ٹیلی فون بھی لگ گیے ہیں۔ لوگ سکون کے ساتھ دینی اور تعلیمی کام میں مشغول ہیں۔

اختلافی معاملہ کو جلسہ جلوس کا مسئلہ بنانا اس کی نزاکت کو بڑھاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر خاموشی کے ساتھ اس کے حل کی تدبیریں کی جائیں تو مسئلہ کے حل کی راہیں نکل آتی ہیں۔

اسی طرح مجھے ایک قصبہ کے بارے میں معلوم ہے۔ وہاں مسلمان ایک مسجد اور مدرسہ بنا رہے تھے۔ بنیاد کھودی جانے لگی تو دوسرے فرقہ کے کچھ لوگ آئے اور انھوں نے کہا کہ ہم یہاں سے دیوار نہیں اٹھنے دیں گے۔ آپ دو گز پیچھے لے جاکر اپنی دیوار اٹھائیے۔ مدرسہ کے ذمہ دار فوراً راضی

ہوگئے اور کام کو روک دیا۔ اگلے دن اس فرقہ کے بڑے لوگ ان کے پاس آئے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے بعض نادانوں نے آپ کی تعمیر میں رکاوٹ ڈالی تھی۔ ہم نے انھیں سمجھا دیا ہے۔ آپ پہلے جہاں دیوار اٹھا رہے تھے دوبارہ وہیں سے اپنی دیوار اٹھائیے، ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر مسئلہ نادانی سے پیدا ہوتا ہے اور اس کو دانش مندی کے ذریعہ ختم کیا جاسکتا ہے۔ یہی معاملہ فرقہ وارانہ مسئلہ کا بھی ہے۔ فرقہ وارانہ جھگڑوں کے پیچھے ہمیشہ کچھ نادانوں کی نادانیاں شامل رہتی ہیں۔ اگر دوسرے لوگ آگے بڑھ کر دانش مندی کا طریقہ اختیار کریں تو یقینی طور پر ہر جھگڑا اپنے آغاز ہی میں ختم ہو جائے گا۔

نوٹ: یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو، بمبئی سے ۱۲ اپریل ۱۹۸۷ کو نشر کی گئی۔

اسلام دور جدید میں

امیر شکیب ارسلان (۱۸۶۹ - ۱۹۴۶) کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے : لماذا تأخر المسلمون وتقدم غیرھم (مسلمان کیوں پیچھے ہو گئے اور ان کے سوا دوسرے کیوں آگے ہو گئے) یہ کتاب ۵۰ سال پہلے چھپی تھی۔ حال میں میں نے ایک عربی مجلہ رابطۃ العالم الاسلامی (اپریل ۱۹۸۵) میں ایک مضمون پڑھا۔ اس مضمون کا عنوان دوبارہ حسب ذیل الفاظ میں قائم کیا گیا تھا :

لماذا تأخرنا وتقدم غیرنا

اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان پچھلی نصف صدی سے ایک ہی سوال سے دوچار ہیں۔ اور وہ یہ سوال ہے کہ ہم جدید دور میں دوسری قوموں سے پیچھے کیوں ہو گئے، اور دوسری قومیں ہم سے آگے کیوں نکل گئیں۔ مزید عجیب بات یہ ہے کہ اسی نصف صدی کے اندر جاپان ایٹمی بربادی کے کھنڈر سے ابھرا اور ترقی کی انتہا پر پہونچ گیا۔ چنانچہ حال میں امریکہ میں ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام ہے جاپان نمبر ایک (JAPAN: Number One)

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا یہ انجام کسی موہوم سبب کی بنا پر نہیں ہے، بلکہ معلوم خدائی قانون کی بنا پر ہے۔ اس دنیا کے لیے خدا کا قانون یہ ہے کہ جو گروہ اپنے آپ کو نفع بخش ثابت کرے اس کو دنیا میں ترقی اور استحکام نصیب ہو، اور جو گروہ نفع بخشی کی صلاحیت کھو دے اس کو ہمیشہ کے لیے پیچھے دھکیل دیا جائے۔ قدیم زمانہ کے مسلمان اہل عالم کے لیے نفع بخش بنے ہوئے تھے اس لیے قدیم زمانہ میں انھیں عظمت حاصل ہوئی۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان بے نفع ہو گیے۔ اس لیے موجودہ زمانہ میں انھیں کوئی عظمت حاصل نہ ہو سکی۔

عروج وزوال کا یہ اصول قرآن کی حسب ذیل آیت میں واضح طور پر موجود ہے :

انزل من السماء ماءً فسالت اودية بقدرها فاحتمل السيل زبداً رابياً ومما يوقدون عليه في النار ابتغاء حلية او متاع زبد مثله، كذلك يضرب الله الحق و الباطل فاما الزبد فيذهب جفاءً واما ما ينفع الناس فيمكث في الارض كذلك يضرب الله الامثال ۔

(الرعد ۱۷)

اللہ نے آسمان سے پانی اتارا۔ پھر نالے اپنی مقدار کے موافق بہہ نکلے۔ پھر سیلاب نے ابھرتے جھاگ کو اٹھا لیا۔ اور اسی طرح کا جھاگ ان چیزوں میں بھی ابھر آتا ہے جن کو لوگ زیور یا اسباب بنانے کے لیے آگ میں پگھلاتے ہیں۔ اسی طرح اللہ حق اور باطل کی مثال بیان کرتا ہے۔ پس جھاگ تو سوکھ کر جاتا رہتا ہے اور جو چیز لوگوں کو نفع پہونچانے والی ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے اللہ اسی طرح مثالیں بیان کرتا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا کے لیے اللہ تعالیٰ کا قانون کیا ہے۔ وہ قانون یہ ہے کہ جو گروہ اپنے آپ کو نفع بخش ثابت کرے اس کو دنیا میں بقا اور استحکام ملے۔ اور جو گروہ اپنی نفع بخشی کھو دے وہ یہاں بے قیمت ہو کر رہ جائے۔

اس عالمی قانون کو ایک طرف کتاب الٰہی میں لفظی طور پر بیان کیا گیا ہے۔ دوسری طرف مادی دنیا میں اس کا عملی مظاہرہ کیا جا رہا ہے۔ سورہ رعد کی مذکورہ آیت میں اس نوعیت کی دو مثالیں دی گئی ہیں۔ ایک مثال بارش کی ہے۔ بارش ہوتی ہے اور اس سے نالے بھرتے ہیں تو جھاگ اوپر دکھائی دینے لگتا ہے۔ مگر جلد ہی ایسا ہوتا ہے کہ جھاگ تو ہوا میں اڑ جاتا ہے اور جو چیز اس میں نفع بخش ہے وہ باقی رہتی ہے، یعنی پانی۔

دوسری مثال دھات کی ہے۔ دھات کو تپانے کے لیے جب کٹھالی میں پگھلاتے ہیں تو اس میں ابتداءً اس کا میل کچیل اوپر دکھائی دینے لگتا ہے۔ مگر بہت جلد یہ وقتی منظر ختم ہو جاتا ہے اور جو اصل قیمتی دھات ہے وہ اپنی جگہ باقی رہ جاتی ہے۔

دور اوّل کی مثال

دور قدیم میں اسلام کو غیر معمولی عظمت ملی۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ تقریباً ایک ہزار سال تک اسلام کو آباد دنیا کے قائد کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اسلام

کو یہ عظیم حیثیت اتفاقاً نہیں ملی اور نہ مطالبات کے ذریعہ اس کو یہ حیثیت حاصل ہوئی۔ اس کی وجہ قدرت کا وہی ابدی قانون تھا جس کا اوپر ذکر ہوا۔ یعنی نفع بخشی اور فیض رسانی۔

دنیا کو اسلام سے جو کچھ ملا، اس کے بہت سے پہلو ہیں۔ اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ اسلام نے دنیا کو توہمات (Superstitions) کے دور سے نکالا اور اس کو پہلی بار سائنس کے دور میں داخل کیا۔

آج کی دنیا جس چیز کو اپنے لیے سب سے بڑی نعمت سمجھتی ہے وہ سائنس ہے۔ اور تمام محققین اور منصف مورخین نے تسلیم کیا ہے کہ یہ دراصل اسلام ہے جس نے سائنس کے دور کو پیدا کیا۔ یہاں ہم صرف ایک مغربی مصنف مسٹر بریفالٹ کا قول نقل کریں گے۔ وہ اس موضوع پر تفصیل بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگرچہ یورپی ترقی کا کوئی بھی پہلو ایسا نہیں جس میں اسلامی تہذیب کی فعال اثر انگیزی دیکھی نہ جاسکتی ہو۔ مگر وہ سب سے زیادہ واضح اس قوت کی پیدائش میں ہے جو جدید دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ یعنی طبیعی سائنس اور سائنسی اسپرٹ۔ ہماری سائنس پر عربوں کا قرض انقلابی نظریات کی دریافت کی حد تک نہیں ہے۔ سائنس اس سے کہیں زیادہ عرب تہذیب کی احسان مند ہے، وہ خود اپنے وجود کے لیے اس کی مرہون منت ہے:

> For although there is not a single aspect of European growth in which the decisive influence of Islamic culture is not traceable, nowhere is it so clear and momentous as in the genesis of that power which constitutes the permanent distinctive force of the modern world, and the supreme source of its victory—natural science and the scientific spirit. The debt of our science to that of the Arabs does not consist in startling discoveries of revolutionary theories; science owes a great deal more to Arab culture, it owes its existence.
> Briffault, *Making of Humanity*, p. 190

یہ ایک معلوم تاریخی حقیقت ہے کہ قدیم زمانہ میں تمام دنیا میں شرک کا غلبہ تھا۔ تمام قومیں بے شمار دیوتاؤں کو پوجتی تھیں۔ ہندستانی روایات کے مطابق ان کی تعداد ۳۳ کروڑ تک پہونچ گئی تھی انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) میں تعدد آلہہ کے عنوان کے تحت بتایا گیا ہے کہ مذاہب میں عمومی طور پر یہ بات پائی گئی ہے کہ فطرت کی طاقتوں اور فطرت کے مظاہر کو خدا مان لیا جاتا ہے۔ نہایت آسانی کے ساتھ ان کو تین قسموں میں بانٹا جاسکتا ہے ——— آسمانی، فضائی اور زمینی۔ یہی تقسیم بجائے خود ہند آریائی مذہب میں تسلیم کی گئی ہے۔ چنانچہ سورج ان کے یہاں آسمانی خدا ہے۔ اِندر فضائی خدا ہے جو

طوفان، بارش اور جنگ لانے والا ہے۔ اگنی (آگ دیوتا) زمینی واقعات کا سبب ہے :

A widespread phenomenon in religions is the identification of natural forces and objects as divinities. It is convenient to classify them as celestial, atmospheric, and earthly. This classification itself is explicitly recognized in Indo-Aryan religion: Surya, the sun god, is celestial; Indra, associated with storms, rain, and battles, is atmospheric; and Agni, the fire god, operates primarily at the earthly level (14/785).

اسلام سے پہلے انسان کا حال یہ تھا کہ وہ ہر چیز کو پوجتا تھا۔ وہ سورج اور چاند سے لے کر دریا اور پہاڑ تک ہر چیز کے آگے جھکتا تھا۔ درختوں میں اس نے درخت خدا (Plant deities) اور جانوروں میں اس نے جانور خدا (Animal deities) بنا رکھے تھے۔ دنیا کی تمام چیزیں معبود بنی ہوئی تھیں۔ اور انسان ان کا عبادت گزار۔ اس طرح انسان نے اپنی عظمت کھودی تھی۔ اسلام کے ذریعہ تاریخ میں جو انقلاب آیا اس نے پہلی بار انسان کو اس کی عظمت عطا کی۔

شرک (بالفاظ دیگر مظاہر فطرت کی پرستش) کا رواج قدیم زمانہ میں سائنسی ترقیوں میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ انسان فطرت کے مظاہر کو معبود سمجھ کر انھیں تقدس کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اس لیے اس کے اندر یہ جذبہ ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ ان مظاہر کی تحقیق کرے اور ان کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرے۔ فطرت کے مظاہر جب پرستش کا موضوع بنے ہوئے ہوں تو اسی وقت وہ تحقیق کا موضوع نہیں بن سکتے۔ یہ بنیادی سبب تھا جو طبیعی سائنس کا دور شروع ہونے میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ اسلام نے تاریخ میں پہلی بار اس سبب کو ختم کیا۔ اس لیے اسلام کے بعد تاریخ میں پہلی بار یہ ممکن ہوا کہ طبیعی سائنس کا دور شروع ہوا اور بالآخر اس حد کو پہونچا جس حد کو وہ آج پہونچا ہے۔

آرنلڈ ٹوائن بی نے بجا طور پر لکھا ہے کہ یہ دراصل توحید (Monotheism) کا عقیدہ ہے جس نے جدید سائنس اور صنعتی دور کو پیدا کیا۔ کیوں کہ توحید کے انقلاب سے پہلے دنیا میں عملی طور پر شرک کا غلبہ تھا۔ شرک کے عقیدہ کے تحت آدمی فطرت (Nature) کو پوجنے کی چیز سمجھے ہوئے تھا۔ پھر وہ اس کو تحقیق و تسخیر کی چیز کیسے سمجھتا۔ جب کہ فطرت کو تحقیق اور تسخیر کی چیز سمجھنے کے بعد ہی اس علم کا آغاز ہوتا ہے جس کو طبیعی سائنس کہتے ہیں۔

قرآن میں مختلف انداز سے یہ بات کہی گئی ہے کہ زمین و آسمان کی نشانیوں (مظاہر فطرت) پر غور کرو۔
قرآن میں اس قسم کی سات سو آیتیں شمار کی گئی ہیں جن میں مظاہر فطرت پر غور کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔
اگر بالواسطہ آیتوں کو بھی شامل کیا جائے تو ان کی تعداد ایک ہزار تک پہونچ جائے گی۔ یہ معلوم انسانی تاریخ میں
بالکل نئی آواز تھی۔ کیوں کہ اس سے پہلے انسان صرف یہ جانتا تھا کہ وہ مظاہر فطرت کو پوجے۔ ایک ایسی دنیا
جس میں ہزاروں برس سے انسان صرف یہ جانتا تھا کہ مظاہر فطرت پوجنے کی چیز ہیں، وہاں قرآن
نے یہ آواز بلند کی کہ مظاہر فطرت اس لیے ہیں کہ ان پر غور کیا جائے اور ان میں چھپی ہوئی حکمتوں کو دریافت
کیا جائے۔

اسلام کا یہ پیغام صرف پیغام نہ رہا بلکہ سو سال کے اندر ہی وہ ایک عالمی انقلاب بن گیا۔
اس نے اولاً عرب کے دل و دماغ کو فتح کیا۔ پھر وہ ایشیا اور افریقہ اور یورپ تک پہونچ گیا۔ اس
نے عرب کے بت خانے ختم کر دیئے۔ ایرانی اور رومی شہنشاہیتیں اس زمانہ میں شرک کی سب سے بڑی
سرپرست تھیں، دونوں کو اسلام نے مغلوب کر لیا اور توحید کا غلبہ تقریباً پوری آباد دنیا میں قائم کر دیا۔
اسلام کی اس نفع بخشی کو تمام منصف مزاج مورخین نے تسلیم کیا ہے۔ یہاں ہم انسائیکلوپیڈیا
برٹانیکا (۱۹۸۴) کا ایک پیراگراف نقل کرتے ہیں:

> Islamic culture is the most relevant to European science. There was active cultural contact between Arabic-speaking lands and Latin Europe. Conquests by the Prophet's followers began in the 7th century, and, by the 10th, Arabic was the literate language of nations stretching from Persia to Spain. Arabic conquerors generally brought peace and prosperity to the countries they settled (16/368).

اسلامی تہذیب کا تعلق یورپی سائنس سے بہت زیادہ ہے۔ عربی زبان بولنے والے علاقوں اور
لاطینی یورپ کے درمیان نہایت گہرا ربط قائم تھا۔ پیغمبرؐ کے پیرؤوں کی فتوحات ساتویں صدی عیسوی
میں شروع ہوئیں۔ اور دسویں صدی تک یہ حال ہو گیا کہ عربی زبان ایران سے لے کر اسپین تک
کی تمام قوموں کی علمی زبان بن گئی۔ عرب فاتحین جہاں گئے وہاں عام طور پر وہ امن اور خوش حالی
لے گئے۔

قرآن کے ذریعہ عالمی سطح پر جو فکری انقلاب آیا اس نے تاریخ میں پہلی بار نئی قسم کی سرگرمیاں

شروع کر دیں۔ انسان نے اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پایا جو پوجنے کی چیز نہیں بلکہ برتنے کی چیز تھی، جس کا وہ تابع نہ تھا بلکہ وہ اس کے لیے مسخر کی گئی تھی کہ وہ اس کو اپنا تابع بنائے۔ چنانچہ اسلام کے عظیم الشان اعتقادی انقلاب کے ساتھ ایک عظیم الشان علمی اور ذہنی انقلاب بھی شروع ہوگیا۔ اسلام کے ماننے والوں نے جب ایک قادر مطلق خدا کو پایا تو اسی کے ساتھ انھوں نے دوسری تمام چیزوں کو بھی پالیا۔ انھوں نے ہر میدان میں ترقیاں شروع کر دیں۔ ان سے دنیا کو وہ چیزیں ملنے لگیں جو ابھی تک اس کو نہیں ملی تھیں۔ چنانچہ اس دور میں پیدا ہونے والی جتنی بھی قابل ذکر ترقیاں ہیں ان کا مطالعہ کیجیے تو ہر ترقی کے پیچھے کسی نہ کسی مسلمان کا ہاتھ کام کرتا نظر آئے گا۔

چند تاریخی حوالے

توحید اس دنیا کی سب سے بڑی سچائی ہے۔ توحید کو اختیار کرنے کی وجہ سے دور اول کے مسلمانوں کے لیے یہ ممکن ہوا کہ وہ دنیا والوں کے درمیان ایک ایسی برادری بن کر ابھریں جن کا ہر طرف استقبال کیا جائے اور جن کے ذریعہ سے دنیا والوں کو ہر قسم کا نفع حاصل ہو۔ یہاں ہم اس سلسلہ میں چند مثالیں درج کریں گے۔

۱۔ اسلامی انقلاب کے بعد کئی سو سال ایسے گزرے ہیں جب مسلمان ساری دنیا میں علم طب کے امام تھے۔ دنیا کے بڑے بڑے لوگ مسلم اطبار سے رجوع کرتے تھے اور طب میں مسلمانوں کی تصنیفات ہر جگہ فن طب کا ماخذ بنی ہوئی تھیں۔ یورپ کا سب سے پہلا میڈیکل کالج سلرنو (اٹلی) میں قائم ہوا۔ یہ میڈیکل کالج گیارھویں صدی عیسوی میں قائم [illegible] نصاب بڑی حد تک ان طبی کتابوں پر مشتمل تھا جو عربی زبان سے لاتینی زبان میں ترجمہ [illegible] تھیں۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) نے اس کے تذکرہ کے ذیل میں لکھا ہے کہ یورپ میں بارہویں صدی نے عربی سے لاتینی میں کتابوں کے ترجمہ کا ایک ہیروانہ پروگرام دیکھا۔ یہ بات بہت اہم ہے کہ یورپ کا ابتدائی طبی اسکول جو سلرنو میں قائم ہوا اور دوسرا جو مانٹ پیلیر میں قائم ہوا۔ دونوں [illegible] یہودی ماخذوں سے بہت قریب تھے:

The 12th century saw a heroic program of translation of works from Arabic to Latin. It is significant that the earliest medical school in Europe was at Salerno and that it was later rivalled by Montpellier, also close to Arabic and Jewish sources (16/368).

پروفیسر ہٹی نے اس سلسلہ میں مزید تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ الزہراوی کی کتاب (التصریف لمن اعجز عن التالیف) کا سرجری سے متعلق حصہ گیرارڈ آف کریمونا نے عربی سے لاتینی میں ترجمہ کیا۔ یورپ میں اس کے مختلف اڈیشن چھپے۔ وینس میں ۱۴۹۷ میں، بیسل میں ۱۵۴۱ میں، آکسفورڈ میں ۱۷۷۸ میں۔ یہ ترجمہ صدیوں تک سلرنو اور مانٹ پیلیر اور دوسرے یورپی طبی اداروں میں نصاب تعلیم کا جزء بنا رہا:

The surgical part (of Al-Zahrawi) was translated into Latin by Gerard of Cremona and various editions were published at Venice in 1497, at Basel in 1541 and at Oxford in 1778. It held its place for centuries as the manual of surgery in Salerno, Montpellier and other early schools of medicine.
P.K. Hitti, *History of the Arabs*, 1979, p. 577

آج آپ جدید طرز کے کسی اسپتال یا کسی میڈیکل کالج میں داخل ہوں تو وہاں کی ہر چیز آپ کو مغربی تہذیب کا عطیہ نظر آئے گی۔ مگر چند سو سال پہلے یہ حال تھا کہ آپ وقت کے کسی معیاری اسپتال یا کسی میڈیکل کالج میں داخل ہوں تو وہاں کی ہر چیز اسلامی تہذیب کا عطیہ نظر آتی تھی۔ یہ ہے وہ بنیادی فرق جو مسلمانوں کے ماضی اور ان کے حال میں پیدا ہو گیا ہے۔

۲۔ جغرافیہ ایک بے حد اہم سائنس ہے۔ اس کا تعلق زندگی کے بے شمار شعبوں سے ہے۔ دور اول کے مسلمانوں نے اس فن میں بھی کمال پیدا کیا۔ مثال کے طور پر الادریسی اپنے زمانہ میں دنیا کا سب سے بڑا جغرافی عالم تھا۔ پروفیسر فلپ ہٹی نے اس کی بابت حسب ذیل الفاظ لکھے ہیں:

The most distinguished geographer of the Middle Ages.

یعنی قرون وسطیٰ کا سب سے زیادہ ممتاز جغرافیہ داں۔ الادریسی کے زمانہ میں راجر دوم سسلی کا بادشاہ تھا۔ اس کو ایک جغرافی نقشہ کی ضرورت ہوئی تو اس کو یہ نقشہ جس نے بنا کر دیا وہ یہی الادریسی تھا۔ فلپ ہٹی نے مزید لکھا ہے:

The most brilliant geographical author and cartographer of the twelfth century, indeed of all medieval time, was al-Idrisi, a descendant of a royal Spanish Arab family who got his education in Spain.
P.K. Hitti, *History of the Arabs*, 1979, p. 568

بارھویں صدی عیسوی کا سب سے زیادہ باکمال جغرافی مصنف اور نقشہ نویس، بلکہ پورے قرون وسطیٰ کا سب سے بڑا جغرافی عالم بلاشبہ الادریسی تھا۔ وہ اسپین کے ایک اعلیٰ عرب خاندان میں پیدا ہوا، اور اس کی تعلیم اسپین میں ہوئی۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ الادریسی نے ۱۱۵۴ء میں سسلی کے مسیحی حکمراں (راجر دوم) کے لیے ایک عالمی نقشہ بنایا۔ اس میں ایشیائی علاقوں کی زیادہ بہتر معلومات دی گئی تھیں جو اس وقت تک ابھی انسان کو حاصل نہ ہوئی تھیں:

Al-Idrisi constructed a world map in AD 1154 for the Christian king Roger of Sicily, showing better information on Asian areas than had been available theretofore (11/472).

موجودہ زمانہ میں مسلم ملکوں میں مغرب کے ماہرین (Experts) بھرے ہوئے ہیں۔ مگر ایک وقت تھا جب کہ مسلمان ہر شعبہ کے ماہرین دنیا کو فراہم کر رہے تھے۔ آج مسلمان دنیا والوں سے لے رہے ہیں، مگر چند سو سال پہلے یہ حال تھا کہ مسلمان دنیا کو دینے والے بنے ہوئے تھے۔ کیسا عجیب فرق ہے ماضی میں اور حال میں۔

۳۔ آج مسلم ملکوں کے نوٹ اور سکے مغربی ممالک تیار کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی مسلم ملک خود اپنا سکہ یا نوٹ تیار کرتا ہے تو اس کے لیے بھی وہ مغربی ٹکنالوجی کا مرہون منت ہے۔ مگر ایک وقت تھا کہ یہ مقام خود مسلمانوں کو عالمی سطح پر حاصل تھا۔

پروفیسر ایچ۔ ڈبلیو۔ سی۔ ڈیوس (H.W.C. Davis) نے اپنی کتاب قرون وسطیٰ کا انگلستان (Medieval England) میں انگلستان کے ایک قدیم سنہرے سکہ کی تصویر اس کے دونوں رخ سے چھاپی ہے۔ یہ سکہ برٹش میوزیم میں رکھا ہوا ہے۔ تصویر میں واضح طور پر نظر آرہا ہے کہ سکہ کے ایک طرف عربی رسم الخط میں کلمہ شہادت لکھا ہوا ہے اور دوسری طرف اس وقت کے انگلستان کے بادشاہ اوفاریکس (Offa Rex) کا نام کندہ ہے۔ اسی کے ساتھ سکہ پر بغداد کے مسلمان سکہ گر کا نام بھی درج ہے۔ سکہ کی تصویر کے نیچے پروفیسر ڈیوس نے حسب ذیل الفاظ لکھے ہیں:

Anglo-Saxon gold coin imitating an Arab Dinar of the year 774.

یعنی قدیم انگلستان کا سونے کا سکہ جو ۷۷۴ء میں ڈھالا گیا اور جس میں ایک عرب دینار کی نقل کی

کی گئی ہے۔ یہ ایک تاریخی شہادت ہے جو بتاتی ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی میں مسلمان صنعتی ترقی کے اس مقام پر تھے کہ انگلستان کے نامور بادشاہ ادفارکس (وفات ۷۹۶ء) کو ضرورت محسوس ہوتی تھی کہ وہ اپنے ملک کا سکہ ڈھلانے کے لیے بغداد سے مسلم ماہرین کو بلائے۔ اس وقت انگلستان میں جو سکہ ڈھالا گیا وہ مسلم ممالک کے سکہ (دینار) کی نقل تھا۔ حتی کہ مسلم سکوں کی طرح اس پر کلمہ شہادت بھی عربی رسم الخط میں لکھا ہوا تھا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہزار برس پہلے کے دور میں اسلامی تہذیب ساری دنیا میں کس قدر غالب حیثیت رکھتی تھی۔

۴۔ واسکوڈی گاما (۱۵۲۴ — ۱۴۶۹) ایک پرتگالی ملاح تھا۔ اس کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس نے ۱۴۹۷ میں ہندستان اور یورپ کے درمیان سمندری راستہ دریافت کیا جو کیپ آف گڈ ہوپ ہو کر جاتا تھا۔ مگر یہ عظیم کامیابی اس کو ایک عرب ملاح احمد بن ماجد کے ذریعہ حاصل ہوئی اس کی بابت انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) نے حسب ذیل الفاظ لکھے ہیں:

Vasco da Gama's Arab pilot, Ahmad ibn Majid (7/862).

یعنی واسکوڈی گاما کا عرب جہازراں احمد بن ماجد۔ برٹانیکا کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ واسکوڈی گاما جب پرتگال سے چل کر افریقہ پہونچا تو وہاں موزنبیق کے سلطان نے واسکوڈی گاما کو دو مسلم ملاح دیئے ان میں سے ایک اس وقت بھاگ گیا جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ پرتگالی مسیحی مذہب کے ہیں:

The Sultan of Mozambique supplied daGama two (Muslim) pilots, one of whom deserted when he discovered that the Portuguese were Christians (7/861).

جس جہازراں نے واسکوڈی گاما کا ساتھ دیا اس کا نام احمد بن ماجد تھا۔ وہ نہایت ماہر تھا اور سمندری جہازرانی سے اتنی واقفیت رکھتا تھا کہ اس پر اس نے ایک اہم کتاب لکھی تھی جو مذکورہ سفر کے وقت اس کے ساتھ تھی۔

پروفیسر فلپ ہٹی نے لکھا ہے کہ بحری جہازرانی کے موضوع پر ایک خصوصی کتاب احمد بن ماجد کی ہے جس میں بحری جہازرانی کے نظریاتی اور عملی پہلوؤں کی وضاحت کی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۴۹۸ میں یہی احمد بن ماجد تھا جس نے افریقہ سے ہندستان تک واسکوڈی گاما کی رہنمائی کی:

An exceptional work of major importance is a compendium of theoritical and practical navigation by Ahmad ibn Majid of Najdi ancestry, who, it is claimed, in 1498 piloted Vasco da Gama from Africa to India.
P.K. Hitti, *History of the Arabs*, 1979, p. 689

۵ ۔ پندرھویں صدی عیسوی کے آخر میں جو دریافتیں ہوئیں ان میں سے ایک وہ دریافت ہے جس کو نئی دنیا (امریکہ) کی دریافت کہا جاتا ہے ۔ یہ عظیم دریافت عام طور پر کرسٹوفر کولمبس (۱۴۵۱ — ۱۵۰۶) کے نام کے ساتھ موسوم ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ اٹلی کا کولمبس ہی وہ شخص ہے جس نے اس مہم کی رہنمائی کی ۔ مگر اس کو یہ تصور دینے والے مسلمان تھے کہ وہ اٹلانٹک سمندر میں اپنی کشتی اس امید میں داخل کرے کہ اس ناپید اکنار سمندر کے دوسری طرف اس کو خشکی ملے گی جہاں وہ اتر سکے ۔

پروفیسر ہٹی نے لکھا ہے کہ عربوں نے زمین کے گول ہونے کے قدیم نظریہ کو زندہ رکھا جس کے بغیر نئی دنیا کی دریافت ممکن نہ ہوتی ۔ اس نظریہ کا ایک مبلغ ابو عبیدہ مسلم البلنسی تھا جس نے اس موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی تھی ۔ اس کا زمانہ دسویں صدی عیسوی کا نصف اول ہے ۔ زمین کے گول ہونے کا نظریہ عربی سے لاتینی میں ترجمہ ہو کر ۱۴۱۰ء میں یورپ میں شائع ہوا ۔ اس کو پڑھ کر کولمبس نے اس نظریہ سے واقفیت حاصل کی ۔ اس سے اس نے سمجھا کہ زمین ایک ناشپاتی کی مانند ہے اور یہ کہ زمین کے مغربی نصف کرہ میں بھی ایسا ہی ابھار موجود ہے جیسا کہ اس کے مشرقی نصف کرہ میں نظر آتا ہے ۔

پروفیسر ہٹی کے الفاظ یہ ہیں :

They (Arab) kept alive the ancient doctrine of the sphericity of the earth, without which the discovery of the New World would not have been possible. An exponent of this doctrine was abu Ubaydah Muslim al-Balansi (of Valencia), who flourished in the first half of the tenth century. They perpetuated the Hindu idea that the known hemisphere of the world had a centre or "world cupola" or "summit" situated at an equal distance from the four cardinal points. This *arīn* theory found its way into a Latin work published in 1410. From this Columbus acquired the doctrine which made him believe that the earth was shaped in the form of a pear and that on the western hemisphere opposite the *arīn* was a corresponding elevated centre.
Philip K. Hitti, *History of the Arabs*, The Macmillan Press Ltd., London, Tenth Edition 1979, p. 570.

ہمیں کیا کرنا ہے

اب سوال یہ ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ ماضی میں بلاشبہ مسلمانوں نے بہت بڑی بڑی سائنسی خدمات انجام دی تھیں۔ مگر موجودہ زمانہ میں مسلمان سائنس اور صنعت کے میدان میں تمام قوموں سے پیچھے ہو گیے ہیں۔ آج وہ اس حیثیت میں نہیں ہیں کہ خالص سائنسی اور صنعتی اعتبار سے اہل دنیا کے لیے نفع بخش بن سکیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ ابھی تک صنعتی دور (Industrial age) میں بھی داخل نہیں ہوئے۔ جب کہ بقیہ دنیا، الوین ٹافلر کے الفاظ میں، مافوق صنعتی دور (Super-industrial age) میں داخل ہو گئی ہے۔

Alvin Toffler, *Future Shock*, New York, 1971

مگر امت مسلمہ محفوظ آسمانی کتاب کی حامل ہے۔ اس نسبت سے وہ خود بھی ایک محفوظ امت ہے۔ اس محفوظیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جہاں مواقع بظاہر ختم ہو جائیں وہاں بھی اس کے لیے ایک نیا موقع موجود رہتا ہے۔ خدا نے انسانیت کے لیے عام طور پر اور امت مسلمہ کے لیے خاص طور پر یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ ہر ڈس ایڈوانٹیج کے ساتھ اس کے لیے ایک ایڈوانٹیج ہمیشہ موجود رہے۔ یہی وہ ابدی حقیقت ہے جو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

فان مع العسر یسراً۔ ان مع العسر یسراً (الانشراح) — پس مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی یہ سنت موجودہ زمانہ میں پوری طرح ظاہر ہو چکی ہے۔ سائنس اپنی ترقیوں کی انتہا پر پہونچ کر ایک ایسے سنگین مسئلہ سے دوچار ہے جس کا خود اس کے پاس کوئی حل نہیں۔ نہ سائنسی طبقہ سے باہر کوئی گروہ ایسا موجود ہے جو اس مسئلے کا حل اسے دے سکے۔ یہ صرف مسلمان ہیں جو محفوظ آسمانی کتاب کے حامل ہونے کی وجہ سے اس پوزیشن میں ہیں کہ سائنسی طبقہ کو نیز پوری انسانیت کو اس مسئلہ کے حل کا تحفہ پیش کر سکیں۔

اس معاملہ کی نوعیت سمجھنے کے لیے یہاں میں انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کا ایک پیراگراف نقل کروں گا۔ اس کے تاریخ سائنس (History of Science) کے مقالہ نگار نے اس سلسلہ میں لکھا ہے:

Untill recently, the history of science was a story of success. The triumphs of science represented a cumulative process of increasing knowledge and a sequence of victories over ignorance and superstition; and from science flowed a stream of inventions for the improvement of human life. The recent realization of deep moral problems within science, of external forces and constraints on its development, and of dangers in uncontrolled technological change has challenged historians to a critical reassessment of this earlier simple faith (16/366).

ابھی حال تک سائنس کی تاریخ کامیابیوں کی کہانی تھی۔ سائنس کی فتوحات میں یہ شمار ہوتا تھا کہ اس نے انسانی معلومات میں اضافہ کیا ہے اور جہالت اور توہم پرستی پر فتح حاصل کی ہے۔ سائنس سے ایجادات کا ایک سیلاب نکلا ہے جس نے انسانی زندگی کو بہتر بنایا ہے۔ مگر حال میں یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ سائنس گہرے اخلاقی سوالات سے دوچار ہے۔ بے قید ٹکنالوجی کے خطرات کی وجہ سے اس کی ترقی پر روک لگانے کی باتیں کی جارہی ہیں۔ یہ صورت حال مورخین کو چیلنج کر رہی ہے کہ وہ ان خیالات کا دوبارہ تنقیدی جائزہ لیں جو ابتدا میں سادہ طور پر قائم کر لیے گئے تھے۔

جدید دنیا کا یہی وہ خلا ہے جہاں مسلمان اپنے نفع بخش ہونے کا ثبوت دے سکتے ہیں، اور اس طرح دوبارہ اپنے لیے سرفرازی کا وہ مقام حاصل کر سکتے ہیں جو انھوں نے دنیا میں کھو دیا ہے۔

سائنس کی ابتدائی فتوحات نے بہت سے لوگوں کو اتنا زیادہ متاثر کیا کہ انھوں نے سمجھ لیا کہ اب ہمیں سائنس کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔ سائنس ہماری تمام ضرورتوں کے لیے کافی ہے۔ اس سلسلہ میں بے شمار کتابیں لکھی گئیں۔ جولین ہکسلے (۱۸۸۷-۱۹۷۵) نے اس نقطۂ نظر کی نمائندگی کرتے ہوئے ایک کتاب شائع کی تھی جس کا نام تھا ـــــ انسان تنہا کھڑا ہوتا ہے:

Man Stands Alone

اس کے جواب میں کریسی مارلین (۱۸۸۴-۱۹۴۶) نے ایک کتاب شائع کی جس کا نام بامعنی طور پر یہ تھا ـــــ انسان تنہا کھڑا نہیں ہو سکتا:

Man Does Not Stand Alone

بیسویں صدی کے نصف اول تک انسان کا یہ دعویٰ تھا کہ اس کی سائنس اس کے لیے کافی

ہے۔ مگر اسی صدی کے نصف ثانی میں انسان کو اپنی رائے سے رجوع کرنا پڑا۔ اس سے پہلے جو بات کرلیسی مارلیس جیسے چند مستثنیٰ افراد کہتے تھے، اب وہ عام طور پر لوگوں کی زبانوں سے کہی جارہی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کا اعتراف انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مذکورہ اقتباس میں کیا گیا ہے۔

جدید انسان کی ذہنی حالت کیا ہے، اس کا ایک نمونہ لارڈ برٹرینڈ رسل (۱۹۷۰ - ۱۸۷۲) ہے۔ وہ انگلینڈ کے ایک دولت مند خاندان میں پیدا ہوا۔ اس نے اعلیٰ ترین تعلیم حاصل کی۔ اس کو نوبل انعام ملا جو آج کی دنیا میں سب سے بڑا علمی اعزاز سمجھا جاتا ہے۔ اس نے مذہب کو چھوڑ دیا اور مادی سائنس میں سکون تلاش کرنے کی کوشش کی۔ مگر بھرپور عمر گزارنے کے باوجود اس کو وہ چیز نہیں ملی جس کو سکون کہا جاتا ہے۔ برٹرینڈرسل کی طویل خود نوشت سوانح عمری کے کے آخر میں ہم اس کے ہاتھ سے یہ الفاظ لکھے ہوئے پاتے ہیں:

The inner failure has made my mental life a perpetual battle (p. 727).

اندرونی ناکامی نے میری ذہنی زندگی کو ایک مستقل جنگ میں مبتلا رکھا۔

گلیلیو اور سائنس

آپ سائنس کی تاریخ کی کسی کتاب میں گلیلیو (۱۶۴۲ - ۱۵۶۴) کا باب کھول کر دیکھیں تو وہاں آپ کو اس قسم کے الفاظ لکھے ہوئے ملیں گے:

His use of observation, experiment and mathematics helped lay foundation of modern science.

گلیلیو نے مشاہدہ اور تجربہ اور ریاضی کو جس طرح استعمال کیا اس نے جدید سائنس کی بنیاد رکھنے میں مدد دی۔

گلیلیو کا خاص کارنامہ کیا ہے۔ گلیلیو کا خاص کارنامہ یہ ہے کہ اس نے چیزوں کی ابتدائی صفات کو، جو ابعاد (Dimensions) اور وزن (Weight) پر مشتمل ہیں اور جن کی آسانی سے پیمائش کی جاسکتی ہے، ان کو ان ثانوی صفات سے الگ کر دیا جو شکل، رنگ اور بو وغیرہ سے

تعلق رکھتی ہیں اور جن کی پیمائش نہیں کی جاسکتی۔ ایک لفظ میں یہ کہ اس نے کمیت کو کیفیت سے جدا کر دیا۔

گلیلیو کے اس فعل نے اس بات کو ممکن بنادیا کہ آدمی میٹر کو استعمال کر سکے، بغیر اس کے کہ اس نے میٹر کے بارہ میں ضروری معلومات حاصل کی ہوں۔ اس طرح فطرت کو کام میں لانے کا دروازہ کھل گیا۔ ٹکنالوجی کو ترقی ہوئی اور بے شمار نئی نئی چیزیں بننے لگیں جو انسان کے لیے مفید ثابت ہوئیں۔ مگر زیادہ مدت نہیں گزری کہ انسان کا عدم اطمینان ظاہر ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ اس معاملہ میں سائنس داں یا انجینئر کا معاملہ اس جاہل بڑھئی سے کچھ بھی مختلف نہیں جو لکڑی کو کاٹ کر فرنیچر بناتا ہے، اگرچہ وہ لکڑی کی کیمسٹری کے بارہ میں کچھ نہیں جانتا۔

بعد کی تحقیقات نے بتایا کہ گلیلیو نے چیزوں کے جس ظاہری پہلو کو الگ کر کے اس کو سائنس کے مطالعہ کا موضوع بنایا تھا، اس کے بارہ میں بھی انسان کی معلومات حد درجہ ناقص ہیں۔ انسان نہ صرف پھول کی "خوشبو" سے بے خبر ہے بلکہ پھول کی "کیمسٹری" بھی بہت کم اس کے علم میں آتی ہے۔ ایک چیز جس کو متمدن دنیا کا انسان تین سو سال تک علم سمجھتا رہا وہ بھی آخر کار بے علمی ثابت ہوا۔ برٹرینڈ رسل نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھا ہے:

> As is natural when one is trying to ignore a profound cause of unhappiness, I found impersonal reasons for gloom. I had been very full of personal misery in the early years of the century, but at that time I had a more or less Platonic philosophy which enabled me to see beauty in the extra-human universe. Mathematics and the stars consoled me when the human world seemed empty of comfort. But changes in my philosophy have robbed me of such consolations. Solipsism oppressed me, particularly after studying such interpretations of physics as that of Eddington. It seemed that what we had thought of as laws of nature were only linguistic conventions, and that physics was not really concerned with an external world. I do not mean that I quite believed this, but that it became a haunting nightmare, increasingly invading my imagination.
>
> Bertrand Russell, *Autobiography*, Unwin Paperbacks, London, 1978, pp. 392-93

میں نے اپنی اداسی کے کچھ غیر شخصی اسباب پالیے جیسا کہ عام طور پر اس وقت ہوتا ہے جب کہ آدمی ناخوشی کے ایک گہرے سبب کو نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ موجودہ صدی کے ابتدائی سالوں میں میں ذاتی پریشانیوں میں بہت زیادہ مبتلا رہا ہوں۔ مگر اس وقت میں کم و بیش افلاطونی

فلسفہ کا قائل تھا جس نے مجھے اس قابل بنائے رکھا کہ میں خارجی دنیا میں حسن کو دیکھ سکوں۔ ریاضیات اور ستاروں نے مجھے اس وقت تسکین دی جب کہ انسانی دنیا آسائش سے خالی نظر آتی تھی۔ مگر میرے فلسفہ میں تبدیلی نے اس قسم کی تسکین کو مجھ سے چھین لیا۔ خودی نے مجھ کو بالکل مضمحل کر دیا۔ خاص طور پر اس وقت جب کہ میں نے طبیعیات کی ان تشریحوں کو پڑھا جو اڈنگٹن جیسے لوگوں نے کی ہیں۔ مجھ کو نظر آیا کہ جس چیز کو ہم نے فطرت کے قوانین سمجھا تھا وہ محض الفاظ کا معاملہ تھا۔ اور طبیعیات حقیقۃً کسی خارجی دنیا سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ میں اس کو پوری طرح مانتا ہوں۔ مگر یہ میرے لیے ایک کابوس بن گیا جو میرا پیچھا کر رہا تھا۔ وہ میرے تخیلات پر برابر حملہ کر رہا تھا۔

روحانی تسکین

جو سائنس خارجی دنیا کا علم دینے سے عاجز تھی وہ اس باطنی دنیا کا علم کیا دیتی جس کے بارہ میں اس نے گلیلیو ہی کے زمانہ میں عملی طور پر اپنی نارسائی کا اعلان کر دیا تھا۔ سائنس آدمی کو وہ جھوٹا اطمینان بھی نہ دے سکی جو مادی سطح پر بظاہر ایک انسان کو حاصل ہوتا ہے۔ اور ذہنی اور روحانی سطح کا اطمینان تو نہ اس کے بس میں تھا اور نہ کبھی اس نے اس کو دینے کا دعویٰ کیا۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: الا بذکر اللہ تطمئن القلوب (سن لو کہ اللہ کی یاد ہی سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے) یہی بات بائبل میں ان لفظوں میں آئی ہے: انسان صرف روٹی ہی سے جیتا نہیں رہتا بلکہ ہر بات سے جو خداوند کے منہ سے نکلتی ہے وہ جیتا رہتا ہے (استثنا ۸ : ۳) حضرت مسیح نے اسی بات کو ان لفظوں میں فرمایا: لکھا ہے کہ آدمی صرف روٹی ہی سے جیتا نہ رہے گا بلکہ ہر بات سے جو خدا کے منہ سے نکلتی ہے (متی ۴ : ۴)

انسان اپنے ساتھ ایک مخصوص نفسیات رکھتا ہے۔ اس نفسیات سے وہ اپنے آپ کو جدا نہیں کر سکتا۔ یہ نفسیات ایک برتر تسکین کی طالب ہے۔ انسان کو مادی ساز و سامان کے ساتھ ایک عقیدہ اور ایک اصول حیات بھی درکار ہے۔ سائنس نے انسان کو جو کچھ دیا وہ اپنی آخری صورت میں بھی صرف مادی ساز و سامان تھا۔ سائنس انسان کو ایک قابل اعتماد عقیدہ نہ دے سکی۔

یہی وہ کمی ہے جس نے جدید دنیا کے بے شمار لوگوں کو غیر مطمئن کر رکھا ہے۔ باہر سے دیکھنے والوں کو ان کی زندگیاں پُر رونق نظر آتی ہیں۔ مگر اندر سے ان کی روح بالکل ویران ہو چکی ہے۔

اقدار کا مسئلہ

یہ مسئلہ جس سے آج کا انسان دوچار ہے، فلسفیانہ لفظ میں اس کو اقدار کا مسئلہ (Problem of values) کہا جا سکتا ہے۔ جدید تعلیم یافتہ انسان ایک دہری مشکل سے دوچار ہے۔ وہ جانتا ہے مگر نہیں جانتا۔ معلومات کے ڈھیر کے درمیان وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ کم سے کم اس پوزیشن میں ہوتا جا رہا ہے کہ یہ فیصلہ کر سکے کہ کیا اچھا ہے اور کیا برا۔ وہ اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ وہ کسی چیز کو اچھا اور کسی چیز کو برا سمجھے۔ وہ اس تمیز کو کسی بھی طرح اپنے آپ سے جدا نہیں کر سکتا۔ مگر جب اپنی عقل یا اپنے علم کے ذریعہ وہ اس کو متعین کرنا چاہتا ہے تو وہ اس کو متعین نہیں کر پاتا۔

جوزف وڈ کرچ نے اپنی کتاب "دور جدید کا مزاج" میں اس مسئلہ پر عقلی بحث کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ انسان اگرچہ باعتبار فطرت یہ یقین کرنے کی طرف مائل ہے کہ زندگی کا ایک مقصد ہے اور اچھائی اور برائی کا ایک معیار ہے۔ مگر سائنس اس کا کوئی حتمی جواب نہیں دیتی۔ سائنس کی ترقی اس کو زیادہ سے زیادہ ظاہر کرتی جا رہی ہے کہ ہم ایک ایسی دنیا میں ہیں جہاں اقدار اپنا کوئی موضوعی مقام (Objective status) نہیں رکھتیں۔ انسان اخلا[illegible]روں کی ضرورت محسوس کرتا ہے جس کے مطابق وہ زندگی گزارے۔ وہ وجدانی [illegible]س کی مستقل تلاش میں ہے۔ مگر سائنس کی دریافت کردہ دنیا میں خیر وشر کے تصورات کی کوئی جگہ نہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان ایک اخلاقی جانور ہے جو ایک ایسی کائنات میں ہے جہاں اخلاقی عنصر کا کوئی وجود نہیں:

> Man is an ethical animal [illegible] universe which contains no ethical element.
> Joseph Wood Krutch, *The Modern Temper*, New York, 1929, p. 16

انسان چیزوں کی حقیقت کو جاننا چاہتا ہے مگر سائنس اس کو صرف چیزوں کے ڈھانچہ کا

علم دیتی ہے۔ انسان دنیا کے آغاز و انجام کو جاننا چاہتا ہے مگر سائنس اس کو صرف درمیانی مرحلہ کے بارہ میں کچھ باتیں بتاتی ہے۔ انسان چیزوں کی معنویت کو دریافت کرنا چاہتا ہے مگر سائنس اس کو صرف اس کی ظاہری ہیئت کا پتہ دیتی ہے۔ انسان پھول کی مہک کو سمجھنا چاہتا ہے مگر سائنس اس کو صرف پھول کی کیمسٹری سے آگاہ کرتی ہے۔ انسان ذہن اور روح کی گہرائی میں اترنا چاہتا ہے مگر سائنس صرف جسم کے مادی اجزاء کا تجزیہ اس کے سامنے پیش کرتی ہے۔ ایک لفظ میں یہ کہ انسان "خالق" کے بارہ میں جاننا چاہتا ہے اور سائنس اس کو صرف "مخلوق" کے بارہ میں بتا کر خاموش ہو جاتی ہے۔

یہی بات ہے جس کو ایک مغربی مفکر نے حسرت کے ساتھ اس فقرہ میں بیان کیا ہے —— جو اہم ہے وہ ناقابل دریافت ہے، اور جو قابل دریافت ہے وہ اہم نہیں :

The important is unknowable, and the knowable is unimportant.

اعلیٰ ذریعہ علم

یہی بے اطمینانی جدید دور کے تمام باشعور انسانوں کا پیچھا کیے ہوئے ہے۔ ان کی اکثریت اگرچہ مذہب کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہے مگر انھوں نے یہ بات مان لی ہے کہ جس سائنسی ترقی کو انھوں نے انسانیت کے مسئلہ کا حل سمجھ لیا تھا وہ انسانیت کے مسئلہ کا حل نہ تھا۔ برٹرینڈ رسل نے مغربی فکر و فلسفہ پر ایک ضخیم کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب کے آخر میں ہم اس کے اعتراف کے حسب ذیل کلمات پاتے ہیں :

> (Western philosophers) confess frankly that the human intellect is unable to find conclusive answers to many questions of profound importance to mankind, but they refuse to believe that there is some 'higher' way of knowledge, by which we can discover truths hidden from science and the intellect.
> Bertrand Russell, *A History of Western Philosophy*, 1979, p. 789

مغربی فلسفی کھلے طور پر اقرار کرتے ہیں کہ انسانی عقل کے بس سے باہر ہے کہ وہ ان بہت سے سوالات کا قطعی جواب پا سکے جو انسانیت کے لیے بے حد اہمیت رکھتے ہیں۔ مگر وہ اس کو ماننے سے

انکار کرتے ہیں کہ سائنس کے علاوہ علم کا کوئی اور بلند تر طریقہ ہے جس کے ذریعہ سے ہم ان سچائیوں کو دریافت کر سکیں جو سائنس اور عقل کی دسترس میں نہیں آتیں ۔

آج کے انسان کو یہی بتانا اس کو سب سے بڑی چیز دینا ہے کہ ہاں ، یہاں ایک ایسا بلند تر طریقہ موجود ہے جس کے ذریعہ نامعلوم کو معلوم کیا جا سکے ۔ اور وہ الہام خداوندی ہے ۔ اور یہ الہام خداوندی جہاں اپنی محفوظ شکل میں موجود ہے وہ قرآن ہے ۔

قرآن پوری طرح اپنی اصل حالت میں محفوظ ہے اور تقریباً ڈیڑھ ہزار برس سے مسلسل اپنی صداقت کو ثابت کر رہا ہے ، اس موضوع پر راقم الحروف نے اپنی کتاب " عظمت قرآن " اور دوسری کتابوں میں گفتگو کی ہے ۔ اس کی تفصیل ان کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے ۔

داخلی شہادت

اخلاقی یا مذہبی احساس انسان کے اندر بے حد طاقت ور ہے ۔ ماضی سے لے کر حال تک کا تجربہ بتاتا ہے کہ یہ احساس کسی طرح انسان کے اندر سے ختم نہیں ہوتا ۔ مزید یہ کہ یہ خالص انسانی خصوصیت ہے ۔ کسی بھی نوع کے جانور میں اب تک اخلاقی یا مذہبی شعور کا ہونا ثابت نہ کیا جا سکا ۔

الفرڈ رسل ویلیس (۱۹۱۳ ـ ۱۸۲۳) مشہور ارتقاپسند عالم ہے ۔ تاہم وہ ڈارون کی طرح اس کا قائل نہ تھا کہ ذہن انسانی کی اعلیٰ اور نادر خصوصیات محض انتخاب طبیعی (Natural Selection) کا نتیجہ ہو سکتی ہیں ۔

اسی طرح اس نے لکھا ہے کہ افادیت کا مفروضہ جو کہ در اصل ذہن پر انتخاب طبیعی کے نظریہ کا انطباق ہے ، وہ انسان کے اندر اخلاقی شعور کی پیدائش کی تشریح کے لیے ناکافی معلوم ہوتا ہے ۔ اخلاقی شعور کو اس دنیا میں بے حد مشکلات کے ساتھ کام کرنا پڑتا ہے ۔ طرح طرح کے استثنائی حالات پیش آتے ہیں ۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اخلاقی شعور کے تحت عمل کرنے والا موت سے دوچار ہوتا ہے یا برباد ہو کر رہ جاتا ہے ۔ ہم کیوں کر یقین کر سکتے ہیں کہ افادیت کا لحاظ ایک شخص کے اندر ایک اعلیٰ نیکی کے لیے اتنا پر اسرار تقدس پیدا کر سکتا ہے ۔ کیا افادیت آدمی کے اندر یہ مزاج پیدا کر سکتی ہے کہ وہ سچائی کو بذات خود مقصود و مطلوب سمجھے اور نتائج کا لحاظ کیے بغیر اس پر عمل کرے :

The utilitarian hypothesis, which is the theory of natural selection applied to mind, seems inadequate to account for the development of the moral sense. Such being the difficulties with which virtue (or the moral sense) has had to struggle, with so many exceptions to its practice, with so many instances in which it brought ruin or death to its too ardent devotee, how can we believe that considerations of utility could ever invest it with the mysterious sanctity of the highest virtue—could ever induce men to value truth for its own sake, and practice it regardless of consequences.

"ذہین کائنات" نامی کتاب کا مصنف فریڈ ہائل اپنے قیمتی مطالعہ کا خاتمہ ان الفاظ پر کرتا ہے کہ اگر زمین کو کسی مزید اہمیت کا حامل بننا ہے، اور انسان کو کائناتی اسکیم میں کوئی جگہ پانی ہے تو ضرورت ہوگی کہ ہم افادیت کے نظریہ کو مکمل طور پر ترک کردیں۔ اگرچہ میرا خیال ہے کہ قدیم طرز کے مذہبی نظریات کی طرف واپسی کچھ مفید نہ ہوگی، مگر ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ ایسا کیوں ہے کہ ویلس کے تشریح کے مطابق پر اسرار تقدس ہمارے اندر موجود رہتا ہے اور فردوسی دنیا کی طرف ہمیں اشارہ کرتا ہے کہ کیا ہم اس کی پیروی کریں گے :

If the Earth is to emerge as a place of added consequence, with man of some relevance in the cosmic scheme, we shall need to dispense entirely with the philosophy of opportunism. While it would be no advantage I believe to return to older religious concepts, we shall need to understand why it is that the mysterious sanctity described by Wallace persists within us, beckoning us to the Elysian fields, if only we will follow.

Fred Hoyle, *The Intelligent Universe*, Michael Joseph, London. 1983, p. 251

حقیقت یہ ہے کہ مذہب انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ وہ مذہب کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آج کا انسان بھی اتنا ہی زیادہ مذہب کا ضرورت مند ہے جتنا قدیم زمانہ کا انسان تھا۔ مزید یہ کہ سائنس کی طرف سے مایوسی نے اس کو مزید شدت کے ساتھ مذہب کا مشتاق بنا دیا ہے۔ مگر جدید انسان کی مشکل یہ ہے کہ وہ مذہب کے نام سے جس چیز کو جانتا ہے وہ صرف بگڑے ہوئے مذاہب ہیں۔ اور بگڑے ہوئے مذاہب کے ساتھ انسانی فطرت کو مطابقت نہیں۔ جدید انسان جب اندرونی تقاضے سے مجبور ہو کر مذہب کے بارہ میں سوچتا ہے تو اسی بگڑے ہوئے مذہب کی تصویر اس کے سامنے آجاتی ہے۔ وہ مذہب سے قریب ہو کر دوبارہ مذہب

سے دور ہو جاتا ہے۔

اسلام ایک محفوظ مذہب ہے۔ وہ ان خرابیوں سے یکسر پاک ہے جو انسانی ملاوٹ کے نتیجہ میں دوسرے مذہبوں میں پیدا ہوگئی ہیں۔ انسان کی فطرت جس مذہب کو تلاش کر رہی ہے وہ حقیقۃً اسلام ہی ہے۔ مگر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ اسلام کو اپنے خود ساختہ جھگڑوں کا عنوان بنائے ہوئے ہیں۔ انھوں نے اسلام کو دنیا کے سامنے پیش ہی نہیں کیا، اور اگر پیش کیا تو بگڑی ہوئی خود ساختہ صورت میں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں کو اسلام اور دوسرے مذہبوں میں بظاہر کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ اسلام کو اگر اس کی اصل صورت میں آج کے انسان کے سامنے پیش کر دیا جائے تو وہ یقیناً اس کو اپنی طلب کا جواب پائے گا اور اس کی طرف دوڑ پڑے گا۔

مسلمان سائنس کے میدان میں دوسروں سے پچھڑ گئے ہیں مگر عقیدہ (نظریۂ حیات) کے معاملہ میں وہ آج بھی دوسروں سے آگے ہیں۔ وہ جدید دنیا کو وہ چیز دے سکتے ہیں جس کی آج اسے سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ یعنی خدا کی طرف سے آیا ہوا سچا دین، وہ دین جس کے اوپر آدمی اپنے لیے ایک پر اعتماد زندگی کی تعمیر کر سکے۔ یہ مقام آج مسلمانوں کے لیے خالی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں وہ اہل عالم کے لیے نفع بخش بن سکتے ہیں۔ اور دوبارہ اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کر سکتے ہیں کہ قدرت کا یہ قانون ان کے حق میں پورا ہو ـــــ واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض۔

خبرنامہ اسلامی مرکز — ۳۱

۱۔ ۷ اپریل ۱۹۸۷ کو ایران کے دو شیعہ عالم مرکز میں آئے۔ ان سے معلوم ہوا کہ اسلامی مرکز کا لٹریچر ایران پہونچ چکا ہے اور پسند کیا جا رہا ہے۔ انھوں نے "مذہب اور جدید چیلنج" کا ترجمہ فارسی زبان میں شائع کرنے کی اجازت چاہی تھی۔ انھیں اس کی اجازت دیدی گئی ہے۔

۲۔ اسلامک کونسل آف انڈیا کی طرف سے ۱۷ – ۱۹ اپریل ۱۹۸۷ کو دہلی میں آل انڈیا مسلم کانفرنس ہوئی۔ کونسل کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ ۱۸ اپریل اور ۱۹ اپریل کے اجلاس میں ان کی دو تقریریں ہوئیں۔ ۱۸ اپریل کے اجلاس میں انھیں اجلاس کا صدر مقرر کیا گیا۔

۳۔ ۲۲ اپریل ۱۹۸۷ کو نئی دہلی میں جدید تعلیم یافتہ اصحاب کی ایک میٹنگ ہوئی۔ اس میں ہندو اور مسلم دونوں طبقہ کے لوگ شریک تھے۔ صدر اسلامی مرکز نے اس موقع پر ایک تقریر کی۔ تقریر کا عنوان تھا: سماجی جھگڑے اور ان کا اسلامی حل۔

۴۔ ایک صاحب کشمیر سے لکھتے ہیں کہ میں الرسالہ کا مستقل قاری ہوں۔ الرسالہ کا مطالعہ میری روحانی غذا سے کم نہیں۔ الرسالہ دین اسلام کی بے آمیز دعوت کو فطرت کے ترازو میں تول کر عام کر رہا ہے۔ میرے والد صاحب حال میں انتقال کر گئے۔ کمزوری کی وجہ سے آنکھوں میں مطالعہ کرنے کی طاقت بھی نہ رہی تھی، پھر بھی وہ الرسالہ کا مطالعہ ضرور کرتے تھے۔ اور جب آنکھیں تھک جاتیں تو مجھ سے پڑھوا کر سنتے تھے۔ وہ ہمیشہ کہتے رہتے تھے کہ میری عمر ۹۵ سال ہے لیکن آج تک کبھی بھی میری نظروں سے الرسالہ جیسا رسالہ نہیں گزرا۔ (۱۲ فروری ۱۹۸۷)

۵۔ الرسالہ اور اسلامی مرکز کی مطبوعات کا جن مختلف صورتوں سے اعتراف کیا جا رہا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ کثیر اشخاص اس کے مضامین کو اپنی تقریروں اور تحریروں میں بلا اعلان استعمال کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر کراچی سے ایک کتاب نہایت اہتمام کے ساتھ حال میں شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں ایسی بہت سی عبارتیں شامل ہیں جو اسلامی مرکز کی کتاب سے ماخوذ ہیں، اگرچہ کہیں بھی ان کا حوالہ نہیں دیا گیا

ہے۔ عام زبان میں اس کو سرقہ کہتے ہیں مگر ہمارے نزدیک وہ اسلامی مرکز کی علمی و فکری اہمیت کا بالواسطہ اعتراف ہے۔

۶۔ معلوم ہوا ہے کہ بعض لوگوں نے شادی کے موقع پر تحفہ کے لیے اسلامی مرکز کی کتابوں کا انتخاب کیا۔ مثلاً انھوں نے دولھا کو "رازِ حیات" اور دلھن کو "خاتونِ اسلام" تحفہ میں دی۔ یہ ایک مفید طریقہ ہے۔ ضرورت ہے کہ بڑے پیمانہ پر اس کو اختیار کیا جائے۔

۷۔ الرسالہ انگریزی خدا کے فضل سے دن بدن وسیع تر حلقہ میں پھیلتا جا رہا ہے۔ بہت سے لوگ محسوس کر رہے ہیں کہ یہ اسلام کے وسیع تر تعارف کا بہترین ذریعہ ہے۔ چنانچہ وہ اس کو اپنے ہندو اور عیسائی دوستوں کے نام جاری کروا رہے ہیں۔ اس طرح کی مثالیں تقریباً روزانہ سامنے آ رہی ہیں۔ اس طریقہ کی ہر ایک کو تقلید کرنا چاہیے۔

۸۔ ایک صاحب چھنڈواڑہ سے لکھتے ہیں "خاتونِ اسلام کو پڑھا۔ واقعی اللہ نے بہت بڑا کام آپ سے لیا ہے۔ نئی نسل کی لڑکیوں کے لیے یہ بہترین کتاب ہے۔ بندہ کا سفر امسال انڈونیشیا کا ہوا۔ ملیشیا میں تو آپ کا لٹریچر الحمد للہ پہونچ رہا ہے۔ مگر شاید انڈونیشیا خالی ہے۔ خاتونِ اسلام کے انگلش اڈیشن کو وہاں عام کرنا ضروری ہے۔ تبلیغی سفر میں خاص طور سے بیرونِ ملک آپ کے لٹریچر سے بڑی مدد ملتی ہے۔ اللہ پاک جزائے خیر عطا فرمائیں۔

(۴ شعبان ۱۴۰۷ھ)

۹۔ غالب اکیڈمی (نئی دہلی) میں ۲۷ مارچ ۱۹۸۷ کو سیرت النبی کا جلسہ ہوا۔ اس موقع پر صدر اسلامی مرکز نے تقریر کی۔ تقریر کا موضوع تھا "سیرت کا اخلاقی پہلو" حاضرین میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو صاحبان بھی موجود تھے۔ لوگوں نے تقریر کو غیر معمولی طور پر پسند کیا۔ پروگرام کے ناظم صاحب کی طرف سے بعد کو شکریہ کا جو خط آیا ہے اس میں وہ لکھتے ہیں: تقریر نہایت معلوماتی اور فکر انگیز تھی۔ بعد میں بہت سے حضرات نے جو مجھ سے ملے، تقریر کو سراہا اور آپ کو دوبارہ سننے کی خواہش کا اظہار کیا۔ میرے تمام ساتھی انتہائی مسرور و مطمئن ہیں اور آپ کو مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ایک اور محفل آراستہ کریں جس کے لیے ایک بار پھر آپ کو زحمت دیں گے۔

۱۰۔ ۲۷ مارچ ۱۹۸۷ کو وٹھل بھائی پٹیل ہاؤس میں بعض فرقہ وارانہ مسائل پر غور وفکر کے لیے ایک خصوصی میٹنگ تھی جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے ذمہ دار افراد شریک ہوئے۔ اس موقع پر صدر اسلامی مرکز کو بھی مسلم سائڈ کی طرف سے شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ اس دعوت کے تحت وہ اس میٹنگ میں شریک ہوئے اور زیر بحث موضوع پر اسلامی نقطہ نظر کا اظہار کیا۔

۱۱۔ صدر اسلامی مرکز نے ۸ اپریل ۱۹۸۷ کو ایک پروگرام کے تحت اورنگ آباد اور جامیز اور جلگاؤں کا سفر کیا۔ اس کی مفصل روداد انشاء اللہ آئندہ سفرنامہ کے تحت شائع کردی جائے گی۔

۱۲۔ گول مارکیٹ (نئی دہلی) میں ۱۸ اپریل ۱۹۸۷ کو ایک اجتماع ہوا۔ اس موقع پر صدر اسلامی مرکز نے قرآن کا درس دیا۔ اس درس کا ٹیپ مرکز میں محفوظ کر لیا گیا ہے۔

۱۳۔ شیخ سلیم احمد صاحب (نئی دہلی) اپنے خط مورخہ ۴ مئی ۱۹۸۷ میں لکھتے ہیں: آپ کی تصنیف "خاتونِ اسلام" پڑھی۔ ایک ہی نشست میں پوری کتاب ختم کر ڈالی۔ بہت پسند آئی۔ اس موضوع پر یہ کتاب حرفِ آخر ہے۔ ماہ مئی ۱۹۸۷ کے الرسالہ میں ایک سفر کے ذیل میں ہندستانی مسلمانوں کے تعلق سے جو باتیں (صفحہ ۳۵) پر آپ نے لکھی ہیں وہ بہت جرأت مندانہ ہیں۔ آج کے حالات میں اس طرح کی باتیں لکھنا اور کہنا بہت ضروری ہے۔ دراصل یہی باتیں آپ کو خط لکھنے کا محرک بنیں۔ بہت بہت مبارکباد۔

۱۴۔ ایک صاحب کشمیر سے اپنے خط (۲۷ اپریل ۱۹۸۷) میں لکھتے ہیں: پچھلے سال میرے ایک ہندو دوست نے فروری ۱۹۸۶ کا ایک الرسالہ مجھے دیا۔ پڑھ کر اس قدر حیرانی ہوئی کہ آج سے قبل میں کہاں تھا۔ مجھے یہ رسالہ پڑھنے کو کیوں نہ ملا۔ اس کو بار بار پڑھنے کا جی چاہتا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ آج سے پہلے جتنے بھی شمارے شائع ہوئے سب کا سب پڑھ ڈالوں۔

۱۵۔ مذہب اور جدید چیلنج کا انگریزی ترجمہ God Arises کے نام سے زیر طبع ہے۔ اس میں اصل کے مقابلہ میں کافی اضافہ کر کے اس کو وقت کے مطابق بنا دیا گیا ہے۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحبِ استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ [illegible] یا جائے۔

زرتعاون الرسالہ

زرتعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے	
ہوائی ڈاک	۲۵ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۵ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسؤل نے ستشری ادم انٹرپرائزز - پرائیویٹ لیمیٹڈ - نئی دلی سے چھپواکر دفتر الرسالہ سی - ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

D(SE) 243 R.N. No. 28822/76 June 1987 No. 127